1857ء کی کہانی مرزا غالب کی زبانی
("دستنبو" اور خطوط غالب کے حوالے سے)
مخمور سعیدی
ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی

1857ء کی کہانی مرزا غالب کی زبانی

(''دستنبو'' اور خطوط غالب کے حوالے)

پاپولر سوشل سائنس

1857ء کی کہانی مرزا غالب کی زبانی

(''دستنبو'' اور خطوط غالب کے حوالے سے)

مخمور سعیدی

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

ISBN 978-81-237-5004-0

پہلا این بی ٹی اُردو ایڈیشن: 2007 (ساکا 1929)

1857 Ki Kahani Mirza Ghalib Ki Zubani *(Urdu)*

قیمت: 35.00

ناشر: ڈائریکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا
A-5 گرین پارک، نئی دہلی۔ 110016

فہرست

پیش لفظ

انگریزی سامراج کے خلاف مئی 1857 میں جب میرٹھ سے قومی بغاوت کا آغاز ہوا اور یہ بغاوت تیزی سے پورے ملک میں پھیل گئی، اس وقت مرزا غالب بڑھاپے کی سرحدوں میں داخل ہو چکے تھے۔ سن رسیدگی کے پیدا کردہ جسمانی اضمحلال کی وجہ سے بھی اور ان کی ان مزاجی کیفیات کی وجہ سے بھی جو امن واماں کے ماحول کی متقاضی رہتی تھیں، ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس بغاوت میں عملی طور پر شریک ہو سکیں، لیکن جو واقعات ان کے گرد وپیش رونما ہو رہے تھے، ان سے چشم پوشی انھوں نے نہیں کی۔ وہ دہلی میں باغیوں کی آمد اور دہلی پر ان کے قبضے کے بعد سے، باغیوں کی پسپائی اور دہلی پر انگریزوں کے اقتدار کی بحالی تک، گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلے لیکن شہر کے حالات سے انھوں نے خود کو بے خبر نہیں رکھا اور کسی نہ کسی طرح تمام اہم اطلاعات حاصل کرتے رہے۔ انھوں نے صرف اطلاعات کے حصول پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ انھیں تاریخ وار قلم بند بھی کرتے رہے اور اس طرح ''دستنبو'' وجود میں آئی جس کا ترجمہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔

''دستنبو'' کے بعض اندراجات کی بنا پر کچھ لوگوں نے مرزا غالب پر انگریز دوستی کا الزام لگایا ہے لیکن جس چیز کو انھوں نے انگریز دوستی کا نام دیا ہے وہ دراصل مرزا غالب کی انسان دوستی ہے۔ باغی مشتعل تھے اس لیے بہت سے بے گناہ انگریز مرد اور عورتیں بھی ان کے غیظ وغضب کا نشانہ بنیں۔ مرزا غالب نے ان بے گناہوں کے مارے جانے پر دکھ کا اظہار کیا ہے لیکن انھوں نے اپنے اس دکھ پر بھی پردہ نہیں ڈالا ہے جو انگریزوں کی طرف سے بے قصور ہندوستانی شہریوں پر ڈھائے جانے والے مظالم پر انھوں نے محسوس کیا۔

وہ صدمہ محسوس کیا تھا۔ جو ان کی رگ رگ میں اتر گیا اور انھیں ہمیشہ کے لیے دکھی کر گیا۔ دلی اور دلی والوں کے جان و مال کی بربادی ہو یا قومی تہذیب و تمدن کے دوسرے اہم مرکز لکھنؤ اور لکھنؤ والوں کا استحصال مرزا غالب ان دونوں سانحوں کے ماتم دار تھے۔

مرزا غالب کے رویے کو صحیح تناظر میں سمجھنے کے لیے ایک اور پہلو پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔ ان کے زمانے تک قوم پرستی کے اس تصور سے ہم نا آشنا تھے جس سے ہم آج آشنا ہیں اور اسے تاریخ کی ستم ظریفی ہی کہا جائے گا کہ یہ آشنائی انگریزی تعلیم کا نتیجہ تھی۔ مرزا غالب کے زمانے تک وفاداریاں شخصی نوعیت کی ہوا کرتی تھیں یا پھر گروہی نوعیت کی۔ مرزا غالب اپنی طبعی انسان دوستی کی وجہ سے گروہی عصبیت سے دور تھے، وہ تمام بنی نوع انسان کو رنگ و نسل اور قوم و مذہب کی تفریق سے الگ رکھ کر ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے اس لیے ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ انگریزوں کو اس لیے برا سمجھیں گے کہ وہ رنگ و نسل میں ہندوستانیوں سے مختلف ہیں اور مذہباً عیسائیت کے پیرو ہیں۔ شخصی تعلق کی، مرزا غالب کے ہاں اس دور کے دوسرے اکابر کی طرح بنیادی اہمیت تھی۔ وہ دلی اور لکھنؤ کی عمومی تباہی پر بھی رنج و غم کا اظہار کرتے ہیں لیکن ان شخصیتوں کی ہلاکت، یا ان کے عزو وقار کی پامالی انھیں بہ طور خاص رنجیدہ کر دیتی ہے جن سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ دلی پر انگریزوں کی عملداری بحال ہو جانے کے بعد انگریز حکام نے اس شہر اور اس کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں پر، کہ زیادہ تر باغی فوجی مسلم فرقے ہی سے تعلق رکھتے تھے، جو قہر توڑا، غالب بھی اس کی زد میں آنے سے بال بال ہی بچے تھے، لیکن جب انھیں یہ خبر ملی کہ ان کے ایک مخلص کرم فرما نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو جنھیں انگریزوں نے گرفتار کر لیا تھا، رہا کر دیا گیا ہے اور وہ میرٹھ میں ہیں تو وہ کسی خطرے کی پروا کیے بغیر فوراً ہی ان سے ملنے کے لیے میرٹھ روانہ ہو گئے اور ان کے پاس چند دن گزار کر دلی واپس آئے۔ اس زمانے میں جب سفر کی زیادہ سہولتیں نہ تھیں، سست رفتار سواریوں کا سہارا لینا ہوتا تھا اور اس ماحول میں جو طرح طرح کے خطرات سے بھرا ہوا تھا، مرزا غالب کا ایک دوست کی خیریت پُرسی کے لیے تن تنہا عازم سفر ہونا، ظاہر کرتا ہے کہ انسانی مراسم کی ان کے نزدیک کیا اہمیت تھی اور وہ ان

مراسم کی پاسداری کو کتنا عزیز رکھتے تھے۔

1857 کے واقعات نے مرزا غالب کے دل و دماغ پر کتنا گہرا اثر ڈالا تھا اور جو کچھ وہ دیکھ رہے تھے یا سن رہے تھے، اس سے کتنے دکھی تھے، اس کا زیادہ واضح اظہار ان کے خطوں میں ہوا ہے۔ یہ خط جب وہ اپنے دوستوں یا شاگردوں یا قدر شناسوں کو لکھ رہے تھے اُس وقت یہ بات ان کے ذہن میں نہیں تھی کہ انھیں شائع بھی ہونا ہے اس لیے ان میں انھوں نے زیادہ کھل کر شہر اور اہل شہر پر ٹوٹنے والی مصیبتوں کا بیان کیا ہے اور اپنا ردِّ عمل بھی زیادہ واشگاف لفظوں میں ظاہر کیا ہے۔ ان خطوں کو سامنے رکھا جائے تو بعض لوگوں کی ان بدگمانیوں کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

مرزا غالب کے وہ خطوط جو انھوں نے 1857 کے اواخر اور اس کے بعد کے چند مہینوں میں اپنے قریب و دور کے بعض شناساؤں کو لکھے، ان کے خطوط کے شائع شدہ مختلف مجموعوں میں شامل ہیں۔ میں نے ان تمام خطوط کو یکجا کر کے ایک لڑی میں اس طرح پرو دیا ہے کہ ایک پوری کہانی مرتب ہوگئی ہے۔ یہ کہانی مرزا غالب کے چشم دید واقعات پر مبنی ہے اور اس کہانی کی مدد سے نہ صرف یہ کہ 1857 اور اس کے کچھ بعد تک کے حالات و واقعات کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے بلکہ اپنے عہد کے حساس ترین شاعر کے نہاں خانۂ دل میں بھی جھانکا جاسکتا ہے۔ اپنے عہد کا یہ حساس ترین شاعر انسانی قدروں کی پامالی کا نوحہ گر ہے، اس تہذیب و تمدن کی بربادی پر دکھی ہے جس کا وہ پروردہ ہے اور جس نے اپنے فکر و فن سے خود بھی اس تہذیب و تمدن کی آبیاری کی ہے، وہ ظلم و تعدی کے خلاف اور مظلوم و ستم رسیدہ لوگوں کے حق میں آواز بلند کرتا ہے۔ اس کی یہ آواز اس وقت کے شور و غوغا میں دب کر رہ گئی لیکن فنا نہیں ہوئی، آنے والی نسلوں نے اس آواز کی بازیافت کی اور پذیرائی بھی۔ آج ہم رنگ و نسل اور مذہب و ملت سے اوپر اٹھ کر جس عام انسانی دردمندی کی وکالت کر رہے ہیں، مرزا غالب اپنے زمانے میں اسی انسانی دردمندی کے ایک سچے علم بردار تھے۔

○

مرزا غالب کی ہمہ جہت شخصیت اپنی مثال آپ تھی۔ ایک ٹوٹتے بکھرتے لیکن اپنے پکھ تحفظات اور تعصبات کی حفاظت پر کمربستہ معاشرے میں رہتے ہوئے وہ اپنے انفرادی کردار کے اثبات پر جس طرح مصر رہے، اس کی کوئی دوسری نظیر ان کے دور میں ڈھونڈنے سے بھی شاید ہی مل سکے۔ ان کی شاعری اور ان کی نثر دونوں اس جرأت مندی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ مرزا غالب کو اپنے ایرانی ہونے پر ناز تھا اس لیے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کو بھی انھوں نے اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اردو میں ان کا نثری سرمایہ زیادہ تر ان کے خطوط پر مشتمل ہے لیکن فارسی میں ان کی مستقل تصانیف بھی موجود ہیں۔ ان میں ''دستنبو'' کی خاص اہمیت ہے۔ اسے انھوں نے روزنامچے کے انداز میں قلمبند کیا ہے اور مئی 1857ء سے جولائی 1857ء تک دارالحکومت دہلی میں جو اتھل پتھل ہوئی، باغی ہندوستانی سپاہیوں اور انگریز فوج کے درمیان جو معرکے ہوئے اور اس خونی معرکہ آرائی میں دلی اور دلی والوں پر اور خود ان پر بھی جو مصائب گزرے، ان کی روداد بیان کی ہے۔

کتاب قضا وقدر کے فلسفے پر رائے زنی سے شروع ہوئی ہے جو تین چار صفحات کو محیط ہے۔ اس کے بعد بیان واقعات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے:

''اپنے گھر میں تھا جب میں نے شور وغوغا سنا، کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا، پلک جھپکتے اطراف وجوانب سے صاحب رجمنٹ بہادر اور قلعہ دار کے اندرون قلعہ قتل اور کوچہ و بازار میں سواروں کی دوڑ بھاگ اور شہر میں پیادوں کے پے در پے پہنچنے کا شور بلند ہوا مٹھی بھر خاک بھی نہ رہی جو گل بدنوں کے خون سے سرخ نہ ہوئی ہو اور کسی باغ کا ایک کونہ بھی نہ تھا جو بے برگ وباری کے سبب بہاروں کا قبرستان نہ معلوم ہوتا ہو۔''

انگریز مخالف سپاہیوں کا جو لشکر شہر میں وارد ہوا تھا، غالب بظاہر اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور اسے بے جا قتل وغارت کا مرتکب ٹھہراتے ہیں۔ شہر کی صورت حال ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

''جو بے رتبہ لوگ مٹی بیچنے کے لیے سارا دن زمین کھودتے تھے، انھوں نے مٹی میں سونے کی اینٹیں پالیں اور جو ذی رتبہ لوگ راتوں کو اپنی بزم ناؤ نوش میں آتش گل

سے چراغ کیف ونشاط روشن کرتے تھے، انھیں تاریک حجروں کے اندر ناکامی و ناخوشی کے شعلوں نے پھونک ڈالا۔ شہر کی خوبرو عورتوں کا زیور، بجز اس کے جتنا کچھ کوتوال شہر کی بیوی اور بیٹی کے گوش وگردن میں رہ گیا ہو، سارا کا سارا دوں ہمت سیاہ کار اچکوں کی تھیلی میں پہنچ گیا۔ ان نازنینوں کا رہا سہا سرمایہ نازو انداز تو دولت گداز اودوں نے لوٹ لیا تاکہ اسے اپنے چھچھورے پن کی متاع بنائیں۔"

مرزا غالب کے کئی خطوط میں "دستنبو" کا ذکر آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب قلمبند کرتے ہوئے انھوں نے انگریز حکام کی خوشنودی کو بھی مدنظر رکھا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے ان کی وابستگی کی بنا پر بعض انگریز حاکم ان کی طرف سے بدگمانی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ اس بدگمانی کو دور کرنا چاہتے تھے اور یہ تاثر پیدا کرنا چاہتے تھے کہ وہ انگریز دوست ہیں۔ اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ بیان واقعات میں انھوں نے مصلحت اندیشی سے کام لیا ہو، اس کی داخلی شہادتیں خود کتاب کے متن میں بھی موجود ہیں۔

خط وکتابت مرزا غالب کا محبوب مشغلہ تھا۔ ان کا زیادہ وقت دوستوں کے خط پڑھنے یا انھیں خط لکھنے ہی میں گزرتا تھا۔ اس ہنگامے کے نتیجے میں ڈاک کا نظام ابتر ہو کر رہ گیا۔ غالب اس پر اپنا تاسف ظاہر کیے بغیر کیسے رہ سکتے تھے:

"ڈاک کے نظام کی ابتری نے سینکڑوں کام روک دیے، جہاں بھی جو ہرکارہ تھا اس نے آنا جانا اور خطوں کو پہنچانا چھوڑ دیا۔ ڈاک میں زبانی پیغام کی گنجائش نہیں۔ خطوں کی آمد ورفت کا قاعدہ ہے لیکن اس محکمہ کی ایک اور شاخ ہوتی ہے، جہاں مضراب کی جنبش کی بجائے، جنبش مضراب سے جو خود بخود پیدا ہوتی ہے، ہزاروں پیغامات برآمد ہوتے ہیں۔ اس سارے انتظام کی ابتری اور خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کی بربادی کیا نالہ وبکا کی مستحق نہیں؟ کیا خطوں کی آمد ورفت کا رک جانا اور دوستوں کا احوال معلوم نہ ہوسکنا درخور ماتم نہیں؟"

مرزا صاحب کے احباب کا حلقہ دلی سے باہر بھی اور دلی میں بھی خاصا وسیع تھا۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی ان کے مہربان دوستوں میں تھے۔ باغی انھیں انگریزوں کا ہمدرد

گھوڑے، دو کوہ پیکر ہاتھی، ایک سو اکیس اشرفیاں اور ایک زریں تاج، انواع واقسام کے نایاب موتیوں سے مرصع نذر گزرانا اور ایک جوڑ بازو بند، ہیرے جڑے حلکے لیے محل میں بھجوائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب شان وشوکت اندھیرے گھر میں دیا روشن کرنے کے مترادف تھی اور زمانہ اس رونق کو آنکھ کا ناسور بنا دینے کا منتظر تھا۔ بادشاہ نے اودھ کی پیشکش قبول ہی کی تھی کہ آئینہ وسکندر کی روایت شکست انجام ہوئی اور جام وجمشید کا ہنگامہ اختتام پذیر۔ مقدر جو فوجوں کے شوروغوغا میں گہری نیند سے چونک پڑا تھا، ادھ کھلی آنکھوں کے ساتھ پھر سو گیا۔ نہیں، نہیں، بادشاہ کے مقدر کا ستارہ اس بلندی پر جا پہنچا کہ ہم خاکیوں کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔ جس روز اس سبز قدم نے ایلچی گری کی خدمت انجام دی اور بادشاہ نے بندہ پروری فرمائی، اس کے دوسرے روز کہ پیر کا دن، قمری مہینے کی چوبیس اور ستمبر کی چودہ تاریخ تھی، پہاڑی کے سایہ نشینوں نے اس دبدبے کے ساتھ کشمیری دروازے پر یلغار کی کہ کالوں کی فوج کو بھاگے بغیر چارہ نہ رہا۔"

مرزا غالب انگریزی نظام کی لائی ہوئی برکتوں کے مداح تھے۔ ان کے شخصی مفادات انگریزی حکام سے وابستہ تھے لیکن ان کا خمیر ہندوستانی مٹی سے اٹھا تھا۔ مندرجہ بالا سطور سے چھلکا پڑ رہا ہے کہ اس تمام تر غم وغصے کے باوجود جو باغی ہندوستانی سپاہیوں اور فوجی سرداروں کے خلاف وہ ظاہر کر رہے تھے، ان کی اچانک پسپائی اور انگریز فوجوں کی پیش قدمی کو انھوں نے ایک اندرونی صدمے کے ساتھ ہی قبول کیا ورنہ یہ الفاظ ان کے قلم سے نہ نکلتے۔ "یہ سب شان وشوکت اندھیرے گھر میں دیا روشن کرنے کے مترادف تھی اور زمانہ اس رونق کو آنکھ کا ناسور بنا دینے کا منتظر تھا۔"

دلی پر انگریز فوجوں کے دوبارہ قابض ہو جانے کے بعد شہریوں پر جو بیتی اس کا حال مرزا غالب نے اس طرح بیان کیا ہے:

"دشمن کو مار بھگانے والے فتحیاب جدھر منہ اٹھا، دوڑ پڑے اور جس کی کو راہ میں پایا قتل کر دیا۔ شہر کے بلند مرتبت دانشمندوں میں کوئی نہ تھا جو اپنے عزت وناموس کی خاطر گھر کے دروازے بند کر کے نہ بیٹھ گیا ہو۔ اس مردوں کا گھر خود شہر سے بعد

رہے ہیں۔ نہ کوئی آتا ہے جس سے کچھ کہہ سن سکیں، نہ خود باہر جاتے ہیں کہ شہر میں
سے جو کچھ دیکھنے کا ہے، دیکھ سکیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کان بہرے ہیں،
آنکھیں اندھی اور اس گومگو اور کشمکش کے علاوہ ہمارے لیے روٹی پانی کا قحط۔ ایک دن
ناگہاں بادل گھر آئے، ہم نے ایک چادر تانی اور اس کے نیچے گھڑے رکھ دیے اور اس
طرح پانی حاصل کیا۔ کہتے ہیں بادل پانی دریاؤں سے لاتے ہیں۔ لیکن اس دن تو یہ
بادل پانی چشمۂ حیواں سے لایا اور سکندر بادشاہ جس پانی کو نہ پا سکا وہ اس تلخ کام
شورابہ آشام نے خستہ حالی اور تباہی میں پایا۔"

اس ابتلا میں مرزا غالب کو اپنے اکلوتے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کا صدمہ اٹھانا
ہے

"بھائی نے جو مجھ سے دو سال چھوٹا ہے، تیس سال کی عمر میں عقل و ہوش کھو کر
دیوانگی اور پاگل پن اختیار کیا۔ تیس سال ہوتے ہیں کہ وہ دیوانہ ہے لیکن نہیں ستاتا نہ
شور و غوغا کرتا ہے، بے ضرر زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا گھر میرے گھر سے ایک
اندازاً دو ہزار قدم کی دوری پر ہے۔ اس کی بیوی اور لڑکی نے بچوں اور کنیزوں کے ساتھ
عافیت بھاگ جانے میں سمجھی اور گھر کے دیوانے مالک و مختار اور اثاث البیت اور
ایک عمر رسیدہ دربان اور بوڑھی کنیز کے، اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ اگر میں بہت چاہتا
تو بھی یہ نہ کرسکتا کہ کسی کو بھیجوں اور ان تینوں کو بلواؤں اور سامان یہاں منگواؤں۔ یہ
ایک اور بھاری غم ہے اور دل پر اس غم کے بوجھ سے ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ میں
ہمہ وقت اس فکر میں ہوں کہ بھائی رات کو کس طرح سویا اور دن کو اس نے کیا کھایا؟ اور
بے خبری کا یہ عالم ہے کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ زندہ ہے یا بھوک سے مر گیا۔"

مرزا صاحب کے شب و روز کا حال یہ تھا کہ ایک دن انگریز سپاہی آئے اور کچھ
دوسرے لوگوں کے ساتھ انھیں بھی گرفتار کرکے لے گئے۔ تفصیل مرزا صاحب ہی سے
سنیے

"۵ اکتوبر کو پیر کے اندوہ فزا دن میں دوپہر کے وقت ناگاہ چند گورے اس دیوار
کے راستے سے جو گلی کے "سنگ بست" دروازے سے ملحق ہے ایک چھت پر چڑھ کر

جاؤں اور کس قبرستان میں سپرد خاک کروں۔ پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور سر انجام کار پر کمربستہ ہوئے۔ پٹیالے کے سپاہیوں میں سے ایک کو آگے آگے رکھا، میرے نوکروں میں سے دو کو ساتھ لے کر گئے۔ مردے کو نہلایا، دو تین سفید چادروں میں لپیٹا، ایک مسجد میں جو گھر کے پہلو ہی میں تھی زمین کھودی اور مرنے والے کو وہاں رکھا اور گڑھے کو مٹی سے پاٹ کر چلے آئے۔''

مرزا غالب نے بھائی کا ہجری سال وفات اس مصرعے سے نکالا ہے۔

''کشیدم آہی وگفتم دریغ دیوانہ''

وضاحتاً کہتے ہیں:

''قاری کا ذہن اس مفہوم تک پہنچ جانا چاہیے کہ حسب قاعدہ دریغ دیوانہ کے، 1290 عدد شمار ہوں گے ان میں ''آہی'' کے عدد گھٹانے کے بعد جو 16 ہوں گے وہی 1274 باقی رہ جاتے ہیں جو اس وقت مطلوب ہیں۔''

مرزا صاحب نے یہاں دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے بھائی مرزا یوسف بخار میں مبتلا ہو کر فوت نہیں ہوئے تھے، گوروں کی گولی کا نشانہ بنے تھے۔ لیکن دلی اور اس کے قرب و جوار میں دیگر شہریوں کے خلاف انگریز حاکموں اور فوجیوں نے جو خونریز انتقامی کارروائیاں کیں، مرزا صاحب نے ان کی پردہ پوشی نہیں کی ہے، صاف صاف لکھ گئے ہیں:

''شاہزادوں کے متعلق اس سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا کہ کچھ بندوق کی گولی کا زخم کھا کر موت کے منہ میں چلے گئے اور کچھ کی روح پھانسی کی رسی کے پھندے میں ختم ہو کر رہ گئی۔ کچھ قید خانوں میں ہیں اور کچھ آوارۂ روئے زمین۔ ضعیف و ناتواں بادشاہ پر جو قلعے میں نظر بند ہے، مقدمہ چل رہا ہے۔ جھجر اور بلب گڑھ کے زمینداروں اور فرخ آباد کے مسند آرا کو الگ الگ مختلف دنوں میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہے۔ کوئی اس طرح ہلاک کیا گیا کہ کوئی نہیں کہہ سکتا خون بہایا گیا۔''

آخری فقرے کی نشتریت محسوس کرنے کے قابل ہے۔ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''انصاف سے نہیں گزرا جا سکتا اور جو دیکھا ہے بن کہے رہا نہیں جا سکتا۔ اس نیک طبیعت نے شہر میں مسلمانوں کی آبادکاری کے سلسلے میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ چونکہ سرنوشت آسمانی اس کے ساتھ نہ تھی کام بننا مشکل ہو گیا۔ قصہ مختصر ایک نیک بخت آدمی ہے۔ اگرچہ میرے ساتھ پرانی شناسائی نہیں ہے، اتفاقاً کبھی ملاقات اور بات چیت سے اور کبھی کبھی کوئی تحفہ بھیج کر مجھے احسان مند کرتا ہے۔''

یہ تو ایک ایسے شخص کا احوال ہے جس کی مرزا غالب کے ساتھ پرانی شناسائی نہیں تھی۔ اب ان کے کچھ قریبی ہندو دوستوں کا ذکر ان کی زبانی سنیے

''میرے دوستوں اور شاگردوں میں ہیرا سنگھ جو ایک نیک نہاد اور نیک نام نوجوان ہے مجھ پر بہت مہربان ہے۔ آتا ہے اور میرا غم غلط کرتا ہے۔ اس نیم ویران نیم آباد شہر کے دوسرے لوگوں میں عالی نسب شیو جی رام برہمن جو ایک جوان دانشمند اور میرے بیٹے کی جگہ ہے، اس درویش دل ریش کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے۔ بساط بھر میری فرماں برداری میں مستعد اور غم گساری میں یکتا ہے۔ دور دست دوستوں میں آسمان مہر و مروت کا وہ ماہ کامل، شیوا زباں، ہرگوپال تفتہ جو میرا پرانا ہم دم و ہم آواز ہے فرط محبت سے میں نے اسے اپنے جان و دل میں جگہ دی ہے اور مرزا تفتہ خطاب دیا ہے۔ اس نے میرٹھ سے ایک ہنڈی بھیجی ہے اور غزل اور خط ہمیشہ بھیجتا رہتا ہے۔''

مرزا غالب اس ہنگامۂ دار و گیر سے زندہ بچ نکلے اور ان کا گھر لٹیروں کی دست برد سے بھی محفوظ رہا لیکن ان پر ایک طرفہ افتاد پڑی، اس کی تفصیل بھی انھی کی زبانی سن لیجیے

''زمانے کی نیرنگ سازی پر مرتا ہوں کہ اس لوٹ مار میں، جب شہر کے کسی گھر میں مٹی تک نہیں بچی، اس کے باوجود کہ میرا گھر لٹیروں کی دراز دستی سے محفوظ رہا، میں قسم کھا سکتا ہوں کہ بستر اور پہننے کے کپڑوں کے سوا کچھ گھر میں نہیں رہا۔ اس معمے کا حل اور اس جھوٹ نظر آنے والے سچ کی حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جب کالوں نے شہر پر قبضہ کر لیا، بیگم نے مجھ سے کہے بغیر قیمتی چیزیں، زیور وغیرہ جو کچھ تھا خفیہ طریقے سے میرزادہ کالے صاحب کے گھر بھیج دیا۔ وہاں تہہ خانے میں محفوظ کر کے دروازہ مٹی سے

میرا دار و گیر سے بچنا کرامت اسد اللہی ہے۔ ان پیسوں کا ہاتھ آنا عطیہ ید اللہی۔ حاکم شہر لکھ دے کہ یہ شخص ہرگز پنشن پانے کا مستحق نہیں۔ حاکم صدر، مجھ کو پنشن دلوائے اور پورا دلوائے۔"

پنشن کا قضیہ غالب کے حق میں طے ہو گیا لیکن غالب کے لیے اعزاز کی ایک بڑی چیز جو انھیں پنشن سے بھی زیادہ عزیز تھی دربار و خلعت کی بحالی تھی۔ اس کے لیے مزید جدوجہد کرنی پڑی۔

جب غالب بے گناہ ثابت ہوئے تو مارچ 1863 میں خلعت و دربار بھی بحال ہو گئے۔ غالب لکھتے ہیں:

"دوشنبہ 3 مارچ کو سواد شہر مخیم خیام گورنری ہوا۔ آخری روز میں اپنے شفیق قدیم جناب مولوی اظہار حسین خاں بہادر کے پاس گیا۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ تمہارا دربار اور خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔ متحیرانہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیونکر؟ حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے آکر تمہارے علاقے کے سب کاغذ انگریزی و فارسی دیکھے اور بہ اجلاس کونسل حکم لکھوایا کہ اسد اللہ خاں کا دربار اور نمبر اور خلعت بدستور بحال و برقرار ہے۔"

دوسرے دن سر رابرٹ منٹگمری لفٹنٹ گورنر پنجاب نے بلا کر خلعت دے دیا اور کہا کہ اگر گورنر جنرل کے دربار انبالہ میں شرکت کرو گے تو وہاں بھی خلعت ملے گا۔ غالب اگرچہ لفٹنٹ گورنر صاحب سے کہہ آئے تھے کہ انبالہ کہاں جاؤں گا لیکن مصارف سفر کا انتظام نہ ہونے کے باوجود جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس سے چند ماہ قبل ان کے ہاتھ پر پھنسی نکل آئی تھی جس نے سخت تکلیف دہ صورت اختیار کر لی۔ اس بنا پر انبالہ کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔"

(ماہنامہ "تحریک" دہلی، مارچ 1969)

"دستنبو" آگرہ کے مطبع مفید خلائق میں بہ اہتمام منشی شیو نارائن چھپی تھی اور اس کے سرورق پر درج ذیل عبارت درج تھی "اعلم عالم کتاب مستطاب نادر بجواب فارسی قدیم بے آمیزش لفظ عربی، تصنیف فردوسی ہند نواب اسد اللہ خاں بہادر غالب

کی ہے جو غالب نے والیِ ٹونک نواب وزیر الدولہ کو نذر کیا تھا اور اس کے دوسرے صفحے پر اپنے قلم سے یہ قطعہ لکھا تھا

نذرِ نواب وزیر الدولہ
آں محیطِ کرم و دانش و داد
ہم بدیں حیلہ مگر یاد آید
غالبِ خستہ کہ رفت است زیاد

سید صاحب مرحوم کا یہ مضمون "نوائے ادب" بمبئی کے 1955 سے 1956 تک کے کئی شماروں میں قسط وار شائع ہوا تھا۔

مرزا غالب کو تحقیق لغات کا دعویٰ ضرور تھا لیکن اس میں وہ زیادہ درک نہیں رکھتے تھے، اس کا کچھ اندازہ "برہان قاطع" کے قضیے سے بھی ہوتا ہے۔

"دستنبو" کی مذکورہ اشاعت اول میں اصل متن سے پہلے "قصیدۂ برگزیدہ در مدح خداوند روے زمیں، سایۂ جہاں آفریں، حضرت قدر قدرت، ملکۂ معظمہ انگلستاں خلد اللہ ملک، باعدل والاحسان، مشتمل بر تہنیت فتح ہندوستاں" درج ہے، جس کا مطلع ہے

در روزگار ہا نتواند شمار یافت
خود روزگار انچہ دریں روزگار یافت

یہ قصیدہ کلیات نظم فارسی (مطبوعہ لکھنؤ) میں موجود ہے اور اس کا چونکہ کتاب کے اصل متن سے کچھ تعلق نہیں یہ صرف "ملکۂ معظمۂ انگلستان" کی غلو آمیز مدح سرائی پر مبنی ہے اس لیے میں نے اس کا ترجمہ کرنا غیر ضروری سمجھا۔ قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ یہ قصیدہ اصلاً بہادر شاہ ظفر کو پیش کرنے کے لیے لکھا گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ یہ انھیں پیش کیا جاتا، بساط الٹ گئی۔ غالب نے چند اشعار بدل کر اسے ملکۂ انگلستان سے منسوب کر دیا۔ قاضی صاحب کی یہ تحریر ماہنامہ "تحریک" دہلی میں "ہنگامے کا ابال" سے حوالوں میں نقل ہوئی تھی۔

"دستنبو" کا یہ ترجمہ اوّل 1964 میں ماہنامہ "تحریک" کے غالب نمبر میں چھپا تھا اور

"دستنبو" کا اردو ترجمہ

جل کر کام کرنے اور کام بنانے کے سوا ان کا اور کوئی کام نہیں۔ اگر (ان میں سے) ایک نے سخت گیری (کے وسیلے) سے (بگڑتے) کاموں کو بنانا چاہا اور دوسرے نے نرمی کے ساتھ (زندگی کی) ہنگامہ آرائی روا رکھی، تو یہ سب کچھ (دنیا کو) بنانے سنوارنے کے لیے ہے، تشدد اور بھول چوک نہیں۔

> مطرب جب ساز کے تاروں پر ضرب لگاتا ہے، تو اس کا کیا مقصد ہوتا ہے، یہ ظاہر ہے۔ مسرت، غم کے پردے میں چھپی ہوئی ہے، دھوبی کپڑے کو غصے سے پتھر پر نہیں مارتا۔

دراصل ایک چیز کا کالعدم ہونا، محض دوسری چیز کو وجود بخشنے کے لیے ہے۔ آرام و تکلیف اور سربلندی و پستی سے، جو کچھ (انسان کو) ملے، چونکہ (خدا کی) بخشش ہے، اس لیے سراسر سود و بہبود اور مسرت و شادمانی کا سبب بنے گا۔ دولت مند، محتاج کو تانبے (کے چند فلوس) دے یا چاندی (کے سکے) ریشم (کے تھان کے تھان) عطا کرے یا (ایک) کمبل (بہرصورت اس کی) سخاوت اور بخشش ہے۔ اچھے اور برے اور کم اور زیادہ کی تفریق ایک واہمہ ہے۔ کیا ان بے حقیقت مظاہرِ وجود کے لیے جو ہمیشہ قعرِ فنا میں ہیں، اس قدر بخشش (خداوندی) کافی نہیں کہ وہ (موجود) ہیں۔ بات عامیوں کی رسائی علم و ادراک سے تجاوز کر گئی اور متکلم کو اپنے میں لوٹا لائی۔ مجبوراً میں (اپنی سطح سے) چند درجے نیچے اترتا ہوں تاکہ وہی پہلی سی (عام فہم) باتیں کرسکوں۔ آسمان کی گردش چکی کے پاٹ کی گردش سے مشابہ ہے۔ تو جانتا ہے کہ چکی کے پاٹ کو گردش میں لانے والا کوئی (ضرور) ہے، پھر تو یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ کوئی آسمان کا کارفرما بھی (ضرور) ہے۔ اس سوت کے تانے بانے سے، جو ستاروں کی (بہ یک وقت) مہربان و کینہ جو نگاہوں سے بنا ہے، (جسے) آسمان کے چرخے پر کاتا گیا ہے، (مشیت ایزدی نے) چند پردے بن کر، زمانے کی آنکھوں کے سامنے ڈال دیے ہیں۔ لیکن (خدائی) نشانیوں کو پہچاننے والے اہل نظر جو مخلوق کے وسیلے سے خالق تک پہنچ جاتے ہیں، ہر پردے کے پیچھے خدا کی کارفرمائی اور حکمرانی کا مشاہدہ

گیا۔ فلک پیما منجموں کا خیال ہے کہ جس زمانے میں ایران کے (آخری) تاجدار یزدجرد کی بزمِ عیش، عربوں کی یلغار سے درہم برہم ہوئی، زحل و مریخ برجِ سرطان میں بزم آرا (جمع) تھے۔ ان دنوں بھی سرطان کا وہی تیرھواں درجہ زحل و مریخ کا مشترک مسکن ہے اور یہ شور و شر، یہ جنگ و جدل، یہ خونخواری و خونریزی، یہ ذلت و خواری اور یہ انقلاب و تغیر اسی (نحس اجتماع) کا نتیجہ ہیں۔ (لیکن) دانشمند آدمی ان باتوں کے پھیر میں کب آتا ہے، وہ ایک لشکر کی یلغار تھی، ایک غیر ملک کی طرف سے، اور یہ ایک فوج کا انحراف ہے خود اپنے ہی سرداروں سے۔ جیسا کہ ایران کی قدیم تاریخ، ان دو لڑائیوں اور آویزشوں کی باہمی عدم مشابہت کو ظاہر کرتی ہے، اس مرتبہ بات مذہب کی تھی، تاراج شدہ ایران (ایک) نئے باعظمت دین کی برکتوں سے آباد اور آتش پرستی کی قید سے آزاد ہو گیا۔ اس مرتبہ معاملہ آئین کا ہے، ہندوستانی کس نئے آئین کی توقع پر خوش ہوں؟ اہلِ فارس نے آتش پرستی سے منہ موڑا تو خدا پرستی کا راستہ دیکھا۔ ہندوستانیوں نے منصف (حاکموں) کا دامن ہاتھ سے چھوڑا اور درندوں کی رفاقت کے جال میں پھنس گئے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ دامن و دام اور داد و دد میں کس قدر تفاوت ہے۔ انصاف یہ ہے کہ انگریزی آئین کے سوا، کسی اور آئین (کے تحت) امن و آرام کی امید رکھنا کورچشمی کے مترادف ہے۔ عربوں کے تازیانے سے جو زخم (اہل ایران کو) لگے، اس مبارک مذہب (اسلام) کی اچھائیاں ان کا مرہم بن گئیں۔ زمانہ اس تباہی کے بعد (بھی) اگر بہتری کی کوئی صورت پیدا کرتا تو غمزدہ دلوں سے غم کا بوجھ اٹھ جاتا۔ واقفانِ حال کے خیال میں، اگر اس (ہنگامے) کے بعد، عقل و انصاف (کی بحالی) کا کوئی امکان ہے تو مجھے بتائیں اور میرے غمگین اور خوفزدہ دل پر احسان کریں۔ رعیت بادشاہوں سے برسرِ جنگ ہو، اہلِ لشکر سردارانِ لشکر کا خون بہائیں اور خوشیاں منائیں اور اپنی اس روش پر (شرم و پشیمانی سے) لرزہ نہ اٹھیں۔ اے واقفانِ حکمت اور اے عارفانِ نفع و ضرر! یہ ہنگامہ قہرِ خداوندی کی آگ سے بھڑکا ہے ورنہ ایران کی جنگ اتنی امید سوز اور آرزو گداز نہیں تھی۔

(اضطراب میں) مضراب (ساز کے) تاروں پر بے قاعدہ پڑ رہی ہے۔
اس لیے میں یہ بے ترتیب نغمے چھیڑ رہا ہوں۔

میں نادان نہیں ہوں کہ ستاروں کو اس تابندگی و درخشندگی کے باوجود بے نور اور آسمان کو اس بزرگی و عظمت کے باوصف بے شان و شکوہ سمجھوں اور آسمانی مخلوق کی کارگزاریوں کو جھوٹ جانوں یا ان دو نحس سیاروں (زحل اور مریخ) کے قرب سے، جو کچھ ایک ہزار سال پہلے (ایرانیوں اور عربوں کی جنگ کے وقت) وقوع پذیر ہوا، اسی کی اب توقع رکھوں۔ یہ غمزدہ، مبتلائے دردِ بے درماں، اسی میں بہتری سمجھتا ہے کہ بے چارے اہل زمیں، جنھوں نے نہ سرطان کو دیکھا ہے، نہ مریخ و زحل کے بارے میں، سوا ان کے ناموں کے، کچھ سنا ہے، ان دیکھی اور ان سنی (چیزوں) کا ذکر نہ کریں اور یہ جانیں کہ زمانے نے، کہ ماضی و مستقبل کے سارے راز اس کے سینے میں محفوظ ہیں اور اچھے لوگوں کے کاموں کو تباہ کرنا اس کا پرانا دستور، یہ روا نہ رکھا کہ دانایانِ فرنگ کو (کسی) غیر فوج کے غلبے سے آزردہ کرے، اس نے انھی کی ہر جانب (پھیلی ہوئی) فوجوں کو ان پر (یلغار کے لیے) بھیج دیا۔ کتاب کا ناظر جان لے کہ میں، کہ قلم کی جنبش سے کاغذ پر (الفاظ کے) موتی بکھیرتا ہوں، بچپن سے انگریزی حکومت کا نمک خوار ہوں۔ گویا جب سے میرے منہ میں دانت آئے ہیں، میں نے ان فاتحین عالم کے خوانِ (کرم) سے روٹی پائی ہے۔ سات آٹھ سال ہوتے ہیں کہ بادشاہ دہلی نے مجھے اپنے پاس بلوایا اور چھ سو روپے سالانہ کے عوض تیموری خاندان کے بادشاہوں کی تاریخ لکھنے کی خواہش کی، جسے میں نے قبول کر لیا اور اس میں مصروف ہو گیا۔ کچھ مدت بعد، جب بادشاہ کے قدیم استاد کا انتقال ہو گیا، اصلاحِ سخن (کی ذمہ داری) بھی مجھ پر آ گئی۔ چونکہ سالی اور ضعیفی، پھر میں گوشہ گیری اور تن آسانی کا خوگر، اس سب پر مستزاد، اپنی مشکل عادت کے سبب سے دوسروں کے لوگوں کا بوجھ ہونا، ہر محفل میں جو شخص وہی بات کہے، اس سے ہونٹوں کی طرف تھا۔ ناچار، ہفتے میں ایک دو بار قلعے جاتا اور بادشاہ محل سے باہر آتا تو چند گھڑی خدمت میں حاضر

میں چوہدری کی خوں آرائی سے ڈر جانے والے، نہ تلوار ہاتھ میں، نہ تیر کمان میں۔ اگر کوئی پوچھے تو یہ لوگ گلیوں اور محلوں کی تباہی کے لیے (ہوتے) ہیں، نہ کہ اس لیے کہ جنگ وجدل کے ارادے سے کمر کس کر نکل کھڑے ہوں۔ آخرکار، اس سبب سے کہ تیز رو سیلاب کے راستے میں خس وخاشاک کا بندھ نہیں بندھ سکتا، کوئی چارہ نہ دیکھ کر، ان میں سے ہر ایک، اپنے گھر میں ماتم زدہ ہوکر بیٹھ رہا۔ انھی غم زدوں میں سے ایک میں ہوں، کہ اپنے گھر میں تھا، جب میں نے شور وغوغا سنا۔ چاہو معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پلک جھپکتے، اطراف وجوانب سے صاحب ایجنٹ بہادر اور قلعہ دار کے اندرون قلعہ قتل، اور کوچہ وبازار میں سواروں کی دوڑ بھاگ اور (شہر میں) پیادوں کے پے بہ پے پہنچنے کا شور بلند ہوا۔ مٹھی بھر خاک بھی نہ رہی جو کل بدنوں کے خون سے سرخ نہ ہوئی ہو اور کسی باغ کا ایک کونہ بھی نہ تھا جو بے برگ وباری کے سبب، بہاروں کا قبرستان نہ معلوم ہوتا ہو۔ ہائے وہ عاقل وعادل، نیک طینت، نیک نام حاکم اور آہ وہ خوبصورت، نازک بدن خواتین، جن کے چہرے چاند کی طرح روشن اور جسم بھی چاندی کی طرح دمکتے تھے اور حیف وہ بچے جنھوں نے ابھی دنیا کو دیکھا بھی نہیں تھا، جن کے متبسم چہرے پھولوں کو شرماتے اور جن کی سبک گامی چکور کی چال پر حرف گیری کرتی تھی، کہ یہ سب دفعتاً خون کے بھنور میں جا ڈوبے۔ (فلک کے) انگارے برسانے والی، شعلہ ساماں موت، کہ جس کے ہاتھوں لوگ اپنے منہ نوچنے اور کپڑے کالے کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اگر ان مقتولوں کے سرھانے نالہ وبکا کرے اور ان کے سوگ میں سیہ پوش ہو جائے تو روا ہے اور اگر آسمان گرد بن کر بیٹھ جائے اور زمین سراسیمہ ہوکر بگولے کی طرح اپنی جگہ چھوڑ دے تو بجا ہے

اے فصلِ نوبہار! تنِ گل کی طرح خون میں لوٹ پوٹ

اے زمانے! شب بے ماہ کے مانند تاریک ہو جا

اے آفتاب! (اس غم میں) اپنا منہ پیٹ کر نیلا کر لے

اے چاند! تو (افسردہ) زمانے کے دل کا داغ بن جا

بارے جب اس تاریک دن کی شام ہوئی اور زمین تاریک تر ہوگئی تو (ان) سیہ باطن خیرہ سروں نے بھی شہر میں جا بجا پڑاؤ ڈال دیا اور قلعے کے اندر بھی، باغِ شاہی کو گھوڑوں کا اصطبل اور نشیمنِ سلطانی کو اپنی خوابگاہ بنایا۔ رفتہ رفتہ دور دراز کے شہروں سے (بھی) اطلاعات پہنچیں کہ مختلف فوجوں کے شوریدہ سروں نے، ہر چھاؤنی میں فوجی افسروں کا خون بہایا ہے اور جس طرح مغنی ساز کے پردوں سے (بے دریغ) نوا پیدا کرتے ہیں، نمک حراموں نے ببانگِ دہل نافرمانی کا شور مچایا ہے۔ گروہ در گروہ سپاہیوں اور زمینداروں میں یک دلی ہوگئی اور سب کے سب باہمی مشورہ و گفتگو کے بغیر، دور و نزدیک، ایک ہی کام پر، ایک ساتھ کمر بستہ ہوگئے اور پھر کیسی طاقت سے کمریں کسیں اور کیسے مضبوط (ان کے) "کمر بند" تھے کہ کمر کمر طغیانی خون کے تھپیڑوں کے سوا (کسی طرح) کھل نہ سکیں۔ معلوم ہوتا تھا، جیسے بے شمار لشکر اور بے گنتی ٹڑاوہ، جھاڑو کے تنکوں کی طرح ایک ہی ڈوری سے بندھے ہوئے ہیں۔ ہاں ہندوستان سے امن و آرام کا اس طرح صفایا کہ ان چیزوں کو ڈھونڈیں تو گھاس کے ایک ریشے کے برابر بھی کہیں نہ پائیں، ایسی ہی زمیں آشوب جھاڑو کا متقاضی تھا۔ اب تو ہزاروں لشکر[1] دیکھے گا، سب کے سب صف آراؤں کے بغیر صف آرا، اور ان گنت فوجیں تجھے نظر پڑیں گی، سب کی سب سپہ سالاروں کے بغیر جنگ آمادہ۔ توپیں اور گولے، چھرے اور بارود، سب کچھ انگریزی ذخیرے سے لیا ہوا اور ذخیرے کے مالکوں سے برسر جنگ۔ لڑائی کے سارے طور طریق انگریزوں سے سیکھے ہوئے اور سکھانے والوں کے تئیں کینہ و بغض سے چہرے برافروختہ۔ (آخر) دل بے سنگ و آہن نہیں ہے، کیوں نہ کھٹک جائے، (اور آخر) آنکھ بے رخنہ و روزن نہیں ہے، کیوں نہ آنسو بہائے۔ ہاں حاکموں کی موت پر بھی دلسوزی کرنی چاہیے اور ہندوستان کی بربادی پر بھی اشکباری۔ شہر کے شہر، شہریاروں کے بغیر، بندہ ہائے بے خداوند سے بھرے ہوئے، جیسے باغبانوں سے خالی باغ، بے برگ و بار درختوں سے پٹے ہوئے ہوں۔ لٹیرے قانون کی گرفت سے اور سوداگر محصول کی پابندی سے آزاد۔ گھر کے گھر

ویران اور غمکدے لوٹ کا دسترخوان۔ گمنامی کے نہاں خانوں میں پڑے ہوئے لوگ
بن سنور کر نکلتے ہیں اور اپنی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں، پلکوں کی طرح صف بہ
صف خنجر تانے ہوئے؛ اور نیک طینت آشتی پسند لوگ جب چل کر گھر سے بازار تک
آتے ہیں تو قدم قدم پر مغلوبیت سے جھجکتے ہیں۔ چور اچکے، روزِ روشن میں، دلیرانہ،
سونا چاندی لوٹتے کھسوٹتے ہیں اور راتوں کو ریشم وکمخواب سے بستر آراستہ کرتے
ہیں۔ روشن نسب خاندانوں کو تیل تک میسر نہیں کہ رات کو گھر میں چراغ روشن کریں۔
تاریک راتوں میں جب پیاس کی شدت بڑھتی ہے تو بجلی کے چمکنے کا انتظار کرتے ہیں
تاکہ یہ دیکھیں کہ کوزہ کہاں رکھا ہے اور پیالہ کہاں پڑا ہے (خدا کی) اس بے نیازی
اور بے پروائی کے قربان جایئے، جو بے رتبہ لوگ مٹی بیچنے کے لیے، سارا دن زمین
کھودتے تھے، انھوں نے مٹی میں سونے کی اینٹیں پائیں اور جو ذی رتبہ لوگ راتوں کو
اپنی بزمِ ناؤ نوش میں آتشِ گل سے چراغِ کیف ونشاط روشن کرتے تھے، تاریک
حجروں کے اندر انھیں ناکامی وناخوشی کے شعلوں نے پھونک ڈالا۔ شہر کی خوبرو عورتوں
کا زیور، بجز اس کے جتنا کچھ کوتوالِ شہر کی بیوی اور بیٹی کے گوش وگردن میں (رہ گیا)
ہو، سارا کا سارا دوں ہمت سیہ کار چور اچکوں کی تھیلی میں پہنچ گیا۔ ان نازنینوں کا دہ
سہا (سرمایہ) ناز وانداز، نودولت گدازادوں نے لوٹ لیا تاکہ اسے اپنے چھچھورے
پن کی متاع بنائیں۔ اب عشق پیشہ لوگ، جنھیں خوبرویوں کے ناز اٹھانے تھے، ان بد
خصلتوں کی ناز برداری کرتے ہیں۔ ہر ناکس، ہوائے پندار میں، اپنی خودسرانہ حرکات
کے سبب، چکر کاٹتا ہوا بگولہ اور ہر سبک سر، نشۂ خودنمائی میں، اپنی چھچھوری اچھل کود کے
پیشِ نظر، جیسے پانی پر دوڑتا ہوا تنکا معلوم ہوتا ہے۔ ایک، جو عالی دماغ اور سرافراز تھا،
اسی کی گلی میں، اس کی آبرو مٹی میں ملا دی گئی اور دوسرا، کہ نام ونسب رکھتا تھا نہ
زر وجواہر، بے اندازہ قدر ومنزلت اور بے شمار مال ودولت کا مالک بن بیٹھا۔ جس کا
باپ گلی کوچوں کی ہوا ناپتا پھرتا تھا، اس نے ہوا کو اپنی غلامی میں لے لیا اور جس کی
ماں ہمسائے کے گھر سے آگ مانگ کر لاتی تھی، وہ آگ پر حکم چلانے لگا۔ بے

کے مابین (نفاق کی) آگ بھڑکا تا۔ (آخر) ایک دن وہ بدنیت (حکیم صاحب جیسے) مردِ فرزانہ کے قتل کی نیت سے، ان کی حویلی پر چڑھ آئے۔ عزت مآب (حکیم صاحب) چونکہ اس وقت، قلعے میں، بادشاہ کی خدمت میں تھے، ان گروہ کے چند شوریدہ سر قلعے پہنچے اور ان کو گھیر لیا۔ خداوند بندہ و گمبدار نے بہ کمال مرحمت و کرم، خود کو ان پر ڈال دیا تب اس نازک وقت میں ان کی جان بچی۔ اگرچہ ان کی جان کو کوئی گزند نہ پہنچا لیکن یہ فتنۂ ناروا، جب تک ان کے خاندان کو برباد نہ کر چکا، نہ دبا۔ (ان کا) محل کہ نگار خانۂ چین کی طرح خوشنما اور آراستہ تھا (مفسدوں نے) لوٹ لیا اور محل کی چھت میں آگ لگادی۔ ہر شہتیر اور ہر تختہ جو اس کی چھت میں، انگوٹھی کے نگینے کی طرح جڑا ہوا تھا، خاکستر ہو کر، ڈھیر ہو گیا، دیواریں دھوئیں سے سیاہ پڑ گئیں، جیسے محل خود اپنے ماتم میں سیاہ پوش ہو گیا ہو۔

آسمان کی مہربانی پر نہ جا کہ یہ بے مہر جسے (آج) آغوش (محبت)
میں لیتا ہے، اسے (کل) عذاب میں مبتلا کر رہا ہے۔

ہرگز ہرگز کوئی روسیاہ سے روسیاہ غلام بھی (اپنے) آقا کے ساتھ ایسی دشمنی نہیں برتے گا، جب تک اس کا نطفہ رحمِ مادر میں بحالتِ حیض قرار یاب نہ ہوا ہو۔ یہ نجس نمک حرام جس کے داغدار چہرے کو (قدرت کی طرف سے) پھٹی ہوئی آنکھیں اور (بدنما) چوڑا دہانہ ملا ہے، خود کو خوبصورتی میں ماہ و مشتری کا تیسرا شمار کرتا ہے۔ ہر جگہ کولھے مٹکاتا، بھوؤ دکھاتا پھرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ خوش رفتاری میں کبک و تدرو پر بازی لے گیا ہے۔ اس کا نام میں اس لیے نہیں لیتا کہ گدا زادہ بے ننگ و نام ہے، اس پر لعنت بھیج کر، کہ یہ ایک مستحسن فعل ہے، اشہب قلم کو پھر اسی اگلی ڈگر پر لاتا ہوں۔

بادشاہ کے نام کی اس بلند بانگ شہرت نے کہ فوجیں (اس کے زیرِ سایہ) جمع ہو رہی ہیں، دور و نزدیک، ہر سر میں سودا بھر دیا۔ فرخ آباد کا نامور سردار تفضل حسین خاں بھی، جس نے کبھی (بادشاہ) سے رابطۂ نیاز مندی نہیں رکھا تھا، غائبانہ سجدۂ تعظیم

چونک پڑا تھا۔۔۔ وہ بھی آنکھوں کے ساتھ ہم ہو گیا۔ نہیں نہیں، بادشاہ کے مقدر کا ستارہ اس بلندی پر جا پہنچا کہ (ہم) خاک نشینوں کی نظر سے اوجھل ہو گیا۔

جب مقدر کے ستارے ڈوبتے ہیں تو تاج و کلاہ بھی بے قدر ہو
جاتے ہیں۔

یہ تو نہیں دیکھتا کہ تجھ حال کے خوف سے خورشید آسمان پر کس طرح
تپتا ہے۔

جس روز اس بزرگ قوم نے، انگریزی کی خدمت انجام دی اور بادشاہ نے بندہ پروری فرمائی، اس کے دوسرے روز پیر کا دن، قمری مہینے کی چوبیس اور ستمبر کی چودہ تاریخ تھی، پہاڑی کے سایہ نشینوں نے اس دبدبے کے ساتھ، کشمیری دروازے پر یلغار کی۔ کالوں کی فوج کو بھگائے بغیر چارہ نہ رہا۔

جس نے (مئی دو) اختلاف کو دلی میں گزارا تھا تو ستمبر کے مہینے نے
فتنہ جنگ کو کہاں رہنے دیا اور امن و انصاف کو واپس لے گیا۔ چار مہینے چار
دن بعد (فتنہ و فساد کے اندھیرے میں گم کی ہوئی) زمین کو روشن کرنے
والا (امن و انصاف کا) سورج طلوع ہوا۔

دلی باغیوں سے خالی ہو گئی (اور) دانشمندوں نے بہادری کے ساتھ
اس پر قبضہ کر لیا۔

یہ چند کہ گیارہ مئی سے چودہ ستمبر تک، چار مہینے چار دن کا وقفہ ہے، لیکن معاملہ چونکہ اس طرح صورت پذیر ہوا کہ شہر پیر کے دن ہاتھ سے نکلا اور پیر کے دن ہی قبضے میں آیا۔ اس سے یہ ہو سکتا ہے کہ شہر کا ہاتھ سے جانا اور (دوبارہ) ہاتھ آنا، ایک ہی دن ہوا۔ قصہ مختصر، دشمن کو دور بھگانے والے فتحیاب، جدھر منہ اٹھا دوڑ پڑے اور جس کو راہ چلتے پایا، قتل کر دیا۔ شہر کے بلند مرتبت، دانشمند لوگوں میں کوئی نہ تھا جو اپنے ننگ و ناموس کی حفاظت کی خاطر، گھر کے دروازے بند کر کے نہ بیٹھ گیا ہو۔ اس بدخو فوج میں سے، جو شہر میں مقیم تھی، بہتوں نے فراری کی ٹھانی اور تھوڑوں نے مقابلے کے

میں بے حد تہی دست اور بے سروسامان ہوں، لیکن کب تک شعروانش
سے خوش ہوتا رہوں کہ یہ جواہر میری کان سے ہیں۔

جو فرمان روز ازل جاری ہو چکا، بدل نہیں سکتا اور چونکہ کل مخلوقات کی سرنوشت مقدر، اسی وقت لکھ دی گئی ہے اور جملہ حوادث کا خمیر اسی روز اٹھ چکا ہے، اس لیے ہماری آسودگی اور نا آسودگی اسی فرمان کی رو سے ہے، پس بہتر یہی ہے کہ ہم ملول و بے دل نہ ہوں اور جس طرح بچے، ہر تماشا خوش ہو کر دیکھتے ہیں، ہم تلون شعار زمانے کی شعبدہ بازی، اس بڑھاپے میں، رضا مندی کے ساتھ دیکھتے رہیں۔ جمعہ کے دن، کہ ماہ محرم کا اٹھائیسواں اور ستمبر کا اٹھارواں روز تھا، دن چڑھے، اس ساعت میں جب برج عقرب کے درجوں میں سے ایک درجہ اس واژگوں آسمان کے مشرقی کنارے پر تھا، بہجت افروز روشن سورج، برج سنبلہ کے درجوں میں سے ایک درجے میں پہنچ کر، گہن میں آ گیا اور (روز روشن میں) دنیا پر تاریکی مسلط ہو گئی۔ ان پانچ دن میں گم کردہ راہ کالے، شہر کے اندر اور باہر سے خنزیروں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے اور ملک گیروں نے شہر اور قلعے پر مکمل قبضہ کر لیا۔ پکڑ دھکڑ اور مار دھاڑ کا شور اس گلی تک پہنچ اور خوف سے سب کے دل پھٹ پڑے۔ جاننا چاہیے کہ اس گلی سے ایک ہی راستہ نکلتا ہے اور گھر دس بارہ سے زیادہ نہیں۔ گلی میں کنواں (بھی) نہیں۔ بیشتر عورت مرد، اس طرح کہ عورتوں کی گود میں بچے اور مردوں کے کاندھوں پر سامان، نکل بھاگے۔ باقی ماندہ چند نفوس کے ساتھ مل کر، کہ (ان کی) بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، سب نے اندر سے (گلی کا) دروازہ بند کیا اور اس کے گرداگرد (پتھر چن دیے) اس طرح کہ گلی، جو سر بستہ تھی، در بستہ ہو گئی۔

میری روح اگر میرے جسم سے بھی زیادہ خستہ ہو تو تعجب نہیں کیونکہ میرا
دل (فرط اندوہ سے) قید خانے کے کسی کونے سے بھی زیادہ تنگ ہے۔

اس اثناء میں کشائش (کی ایک صورت) ظہور پذیر ہوئی۔ تفصیل یہ ہے کہ خورشید شکوہ، کیواں جاہ، مریخ حشم راجہ نریندر سنگھ بہادر، فرماں روائے پٹیالہ اس لڑائی

فریاد اس گریہ وزاری سے، فریاد اس دل خواری سے، فریاد اس بے
چارگی وخستہ حالی سے، فریاد اس خانہ بربادی ومجبوری سے۔

تیسرے روز، جیسا کہ بیان میں آیا، مہاراجہ کے سپاہی آئے، پہرہ دینے [illegible] گلی والوں نے لٹیروں کے گھس آنے کے خوف سے نجات پائی۔ [illegible] اور سپاہیوں سے باہر جانے کی اجازت چاہی۔ چونکہ پہرہ داری کے لیے تھے، نہ کہ دشمنی کے لیے، خواہش اس طور پر منظور ہوئی کہ چوک کے بازار تک جایا جا سکتا ہے، چوک سے آگے مقتل ہے۔ مجبور خستہ حالوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ [illegible] اور [illegible] اور پکھال، (یہ چیزیں) عنقا کا حکم رکھتی تھیں، ہر گھر سے ایک مرد اور میرے نوکروں میں سے دو نوکر گئے۔ چونکہ میٹھا پانی دور تھا اور دور نہیں جانا چاہیے تھا، مجبوراً کھاری پانی گھڑوں اور صراحیوں میں بھر لائے۔ آخر وہ آگ، جس کا دوسرا نام پیاس ہے، اس نمکین پانی سے بجھنے میں آئی۔ باہر جانے اور پانی لے کر آنے والے کہتے تھے کہ اس گلی میں جس سے آگے جانے کی ہمیں اجازت نہیں، فوجیوں نے چند دکانوں کے دروازے توڑ دیے ہیں لیکن نہ بورے میں آٹا نظر پڑا ہے، نہ برتن میں تیل۔ میں نے کہا، بندہ وہ اچھا جو برتن اور بورے، تیل اور آٹے کی بات نہ کرے۔ ہماری روزی اس کے ذمے ہے جو ہمیں نظر انداز نہیں کرتا۔ خدا کی بخششوں کا شمار [illegible] نقل ہے۔ ان دنوں میں کہ ہم خود کو قیدی سمجھتے ہیں اور حقیقت میں قیدیوں ہی کی زندگی گزار رہے ہیں، نہ کوئی آتا ہے جس سے کچھ سن سکیں، نہ خود باہر جاتے ہیں کہ آنکھوں سے جو کچھ دیکھنے کا ہے، دیکھ سکیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کان بہرے ہیں اور آنکھیں اندھی ہیں اور اس گومگو اور کشمکش کے علاوہ ہمارے لیے روٹی پانی کا قحط۔ ایک دن ناگہاں بادل گھر آئے اور پانی برسا۔ ہم نے (گھر کے صحن میں) ایک چادر تانی اور اس کے نیچے ایک گھڑا رکھ دیا۔ (اس طرح) پانی حاصل کیا۔ کہتے ہیں، بادل پانی دریاؤں سے لاتے ہیں اور زمین پر برساتے ہیں۔ یہ گراں مایہ [illegible] بادل، پانی چشمۂ حیواں سے لایا اور سکندر بادشاہی میں جس کا جویا تھا، وہ اس [illegible]

پانچ سال ہوتے ہیں کہ دو بے ماں باپ کے بچوں کو، اپنی بیوی کے خاندان سے، کہ میری مصیبتوں کا باعث وہی ہے، میں نے گود لیا ہے اور ان شیریں گفتاروں کے ساتھ، جو نیا بولنا سیکھے ہیں، میں محبت سے گھل مل گیا ہوں۔ اب بھی اس خستہ حالی میں میرے ساتھ ہیں اور میرے دامن دریاں کے پھول اور موتی۔ بھائی نے جو مجھ سے دو سال چھوٹا ہے، تیس سال کی عمر میں عقل وہوش تج کر، دیوانگی اور پاگل پن اختیار کیا۔ تیس سال ہوتے ہیں کہ وہ دیوانہ جو کسی کو نہیں ستاتا نہ شور وغوغا کرتا ہے، بے سدھ زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا گھر میرے گھر سے الگ، اندازاً دو ہزار قدم کی دوری پر ہے۔ اس کی بیوی اور بیٹی نے، بچوں اور کنیزوں کے ساتھ، عافیت بھاگ جانے میں سمجھی اور گھر کے دیوانے مالک کو، مع گھر اور اثاث البیت اور ایک عمر رسیدہ دربان اور بوڑھی کنیز کے، اپنے حال پر چھوڑ گئیں۔ اگر میں جادو جانتا ہوتا تو بھی یہ نہ کرسکتا تھا کہ کسی کو بھیجوں اور ان تینوں کو بلوا لوں اور سامان یہاں منگوا لوں۔ یہ ایک اور بھاری غم ہے اور دل پر اس غم کے بوجھ سے، ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ وہ بچے نازک، ناز پروردہ، دودھ اور مٹھائی چاہتے ہیں، میوہ اور پھل ڈھونڈتے ہیں اور ان کی خواہش پوری نہیں ہوتی۔ ہے ہے یہ کیا گل ہے کچھ کہنے کا' جب تک زندہ ہیں روٹی پانی کی فکر رہے گی اور مر جائیں گے تو کفن دفن کی۔ میں ہمہ وقت اس فکر میں ہوں کہ بھائی رات کو کس طرح سویا اور دن کو اس نے کیا کھایا؟ اور بے خبری کا عالم یہ ہے کہ میں نہیں کہہ سکتا وہ زندہ ہے یا سختی اٹھاتے اٹھاتے مر گیا۔

میں نفس پہ لب ہی نہیں۔ جاں آفریں کی قسم کہ میں (غم سے) جاں بہ لب بھی ہوں۔

جو کچھ میں نے کہا ہے جانگزا ہے اور جو کچھ نہیں کہا، روح فرسا۔ جو لوگ حالات سے واقف ہیں، میں ان سے توقع رکھتا ہوں کہ میری فریاد پر کان دھریں اور سن کر انصاف کریں۔ اس آخری عمر میں جب میں نہ از روئے روشنی و درخشندگی، بوچھنے چراغوں کے ٹھنڈے پڑ جانے اور دن ڈھلے سورج کے ماند ہو جانے سے مغلوب

ملکۂ معظمہ کی زبان سے مہر طرازی، ان کے فرمان سے سراپا بخشش اور ان کے طوان (کرم) سے نان ریزے کا آرزومند ہے۔ مہر خواں اور سراپا کا ترجمہ عربی بول چال میں خطاب وخلعت اور نان ریزے کا مترادف انگریزی زبان میں پنشن ہوسکتا ہے۔ بلند رتبہ حاکم نواب گورنر جنرل بہادر نے جواب میں (میرے دردمند دل کو) مژدۂ درماں بھیجا اور اطلاع دی کہ خط پہنچا اور انگلستان روانہ ہوگیا۔ دل فرط انبساط سے اتنا بالیدہ ہوا کہ جسم میں، اور جسم جامے میں نہیں سماتا تھا۔ چار ماہ بعد مبارک طینت، فرخ شمائل اور دانش مند حاکم مسٹر رسل کلارک بہادر کے خامۂ مشکبار کا لکھا ہوا بخشائش نامہ جو میری معروضات کے جواب میں ہے، آیا (اور اس نے) امیدواری اور آرزو شماری (کی مدت) اور بڑھا دی۔ میں جانتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں امن وانصاف کی بساط الٹ نہ گئی ہوتی اور خدا ناشناس سپاہیوں کے ہاتھوں عدالتیں اجڑ نہ گئی ہوتیں تو گلستان انگلستان سے فرمان، انعام واکرام کے ساتھ پہنچتا اور میرے دیدہ ودل نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی ہوتی۔ اب وہ مبارک خطوط جو میری بے تاب آرزوؤں کی فہرست اور میرے بازوئے عقل وہوش کا تعویذ ہیں، میرے پاس، اور چند ٹکڑے جگر کے جو جوش گریہ میں پلکوں سے ٹپکے ہیں، جگر کاوی وخوں باری کی یادگار کے طور پر، میرے دامن میں ہیں۔

نہ میں تیر اور تلوار کا زخم خوردہ ہوں نہ شیر اور چیتے کے ناخنوں کا گھائل۔

میں خود اپنے ہونٹ کاٹ کاٹ کر زبان سے خون چاٹ رہا ہوں میری

خوراک خون ہے اور میں زندگی سے خجل۔

تیس ستمبر کو بدھ کے دن شہر کی فتح اور گلی کی بندش کے سترہویں روز لوگ خبر لائے کہ لٹیروں نے بھائی کے گھر پر چڑھائی کردی اور گھر اور گلی میں لوٹ مار مچائی (البتہ) دیوانے میرزا یوسف خاں اور اس بوڑھے دربان اور بوڑھی ماما کو زندہ چھوڑ دیا ہے۔ بوڑھے دربان اور بوڑھی ماما نے ہندوؤں کی ہمراہی اور دستیاری میں، جو اس بھاگم بھاگ میں کسی دوسری جگہ سے آکر وہاں پناہ گزیں ہوئے ہیں، روٹی پانی

نہیں دی ہے۔ شہر کے درماندہ حالوں میں سے بہتوں کو باہر نکال دیا گیا ہے اور باقی ماندہ اسی طرح امید و بیم کی قید میں پڑے ہیں۔ بیابان گرد گوشہ نشینوں کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ شاید شہر بدر ہو جانے والوں اور اندر رہ جانے والے دل فگاروں، دونوں کے درد کا کوئی درماں نہیں ہے۔ کاش اندر والوں اور باہر والوں کو ایک دوسرے کی زندگی و موت سے آگاہی ہو سکتی تاکہ یہ بے تابی اور پریشانی منہ نہ دکھاتی۔ یقین کے ساتھ اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص جس جگہ ہے محتاج ہے۔ (اندر رہ جانے والے) شکستہ پا ہوں، جو ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں، یا باہر چلے جانے والے راندۂ تقدیر، جو بادیہ گردی میں مبتلا ہیں، سب کے دل درد سے بھرے ہوئے ہیں اور سب کے چہرے موت کے خوف سے زرد پڑ گئے ہیں۔ پانچ اکتوبر کو، دن کے اندوہ افزا دن میں، دوپہر کے وقت، ناگاہ چند گورے، اس دیوار سے ہو کر جو (گلی کے) سنگ بست دروازے سے ملحق ہے، ایک چھت پر چڑھ آئے اور چھت سے کود کر نیچے گلی میں آ گئے۔ راجہ نرندر سنگھ بہادر کے سپاہیوں کا روکنا بے سود رہا۔ (گورے) دوسرے چھوٹے مکانوں کو نظر انداز کر کے، جہاں راقم الحروف تھا، آ پہنچے۔ اپنی خوبی مزاج کے سبب گھر کے اسباب کو چھوا تک نہیں اور مجھے، ان دونوں مبارک شکل بچوں، دو تین نوکروں اور چند نیک کردار پڑوسیوں کے ساتھ۔

پکڑ لے گئے اور چھوڑ دیا

گلی سے دو فرلانگ سے کچھ زیادہ فاصلے پر، اور وہ بھی درشتی یا سخت گیری کے ساتھ نہیں، معاملہ فہم اور دانشمند کرنل براؤن بہادر کے سامنے، جو چوک کی طرف، قطب الدین سوداگر کے مکان میں ٹھہرا ہوا ہے، مجھے لے گئے۔ کرنل نے مجھ سے ساتھ نرمی اور انسانیت سے بات کی، اور مجھ سے نام اور دوسروں سے پیشہ پوچھا اور خوشنودی کے ساتھ اسی وقت گھر کو رخصت کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا، اس کی جہاں آفرینی کہی اور واپس آ گیا۔ اکتوبر کی ساتویں تاریخ کو، بدھ کے روز، دن کے چوتھے پہر میں اکیس توپوں کی آواز نے سامعت کو نوازا اور عقل کو سخت تعجب میں

ان درد ہائے بے درماں اور ان زخم ہائے بے مرہم کے ہوتے، مجھے یہ سمجھنا چاہیے کہ میں مرگیا ہوں، مجھے باز پرس کے لیے اٹھایا گیا ہے اور اعمالِ بد کی پاداش میں، دوزخ کے کنوئیں میں اوندھا لٹکا دیا گیا ہے اور اب ناچار اسی تنگی اور خواری میں سدا جینا ہے۔ ع

اے وائے اگر میرے امروز و فردا بھی ہوں

شروع سے آخر تک اس کتاب میں وہی کچھ ہے جو مجھ پر گزرتا ہے، یا وہ ہوگا جو سننے میں آتا ہے۔ اگر میں نے سن کر کچھ بیان کیا ہے تو کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ میں نے جھوٹ سنا ہوگا یا گھٹا بڑھا کر بیان کیا ہوگا۔ میں داروگیر سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں اور سچائی میں نجات کا خواہاں ہوں۔ آنکھیں بیکار ہوگئی ہیں، دل بتلا میں ہے، لب ساکت ہیں اور کانوں کے کشکول میں دوسروں کی زبان کی (دی ہوئی) معلومات کی بھیک۔ کیسی بری ہے یہ گدائی اور پھر اس بے سروپائی کے ساتھ۔ اور یہ جو بادشاہ اور بادشاہ زادوں کا انجام، جسے فتح شہر کی داستان کا دیباچہ بننا چاہیے تھا، میں نے نہیں لکھا ہے، اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس تحریر میں میرا سرمایۂ بیاں، شنیدہ باتیں ہیں اور ناشنیدہ باتیں ابھی بہت باقی ہیں۔ البتہ میں اس جستجو میں ہوں کہ جب اس تنگ جگہ سے باہر نکلوں تو ناشنیدہ راز ہر طرف سے جمع کرکے، محرمانہ انداز میں قلمبند کروں۔ امید ہے کہ ناظرینِ کتاب، واقعات کی تقدیم و تاخیر کی بنا پر، ازروئے انصاف مجھ پر نکتہ چینی نہ کریں گے۔ 19/اکتوبر کو وہی پیر کا دن، جس کا نام ہفتے کے دنوں کی فہرست سے کاٹ دینا چاہیے، ایک سانس میں آتش فشاں اژدہے کی طرح دنیا کو نگل گیا۔ اس دن کے پہلے پہر میں، وہ افسردہ زوڑ دیدہ مودربان، بھائی کے مرنے کی خوش خبری لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار راہِ فنا پانچ دن تک تیز بخار میں جلتا رہا اور رات کے وقت، بارہ بجے، توسنِ (عمر) کو اس تنگنائے سے کودا لے گیا۔ آب و آبچیں سے درگزر، غسال اور گوروکفن کو نہ ڈھونڈ، سنگ و خشت کا نہ پوچھ، چونے گارے کی بات نہ کر اور مجھے بتا کہ میں کیونکر جاؤں (میت کو) کہاں لے

مضمون میں تہنیت فتح اور شگونہ کاشف و فیروزی کے بیان پر مشتمل ایک بہاریہ غزل میں نے لکھی اور جمعہ کے دن 19 فروری کو ڈاک میں روانہ کر دی۔ سنیچر کے دن 20 فروری کو شام کے وقت ایک دیو غریو ہنگ آہنگ توپوں کی آواز، اور اتوار کے دن صبح کے وقت معنوی فتح کی خوش خبری، اس تفصیل کے ساتھ، سننے میں آئی کہ 19 فروری کو آسمان سروری کے اختر تابندہ، نامور سپہ سالار کمانڈر ان چیف بہادر نے سیہ رو ترکوں پر اس بہادری کے ساتھ یلغار کی، کہ آسمان کے سپہ سالار (مریخ) نے بہت دید و سلامت کی اتنی دعائیں دیں اور اتنی بار آفریں کہی کہ اس کے ہونٹوں پر آبلے پڑ گئے اور زبان جلنے سے رہ گئی۔ دنیا کو آبادی کا مژدہ اور دنیا والوں کو آزادی کی نوید، کہ آزاد اور نیک نہاد لوگوں کی آرزو بر آئی اور دنیا میں بدگہر لوگوں کا دور دورہ ختم ہوا۔ پھر سنا گیا کہ توپوں کی آوازیں اور شہنائیوں کے نغمے غلبہ پانے کے شادیانے تھے۔ ظفر مند فوج کے بہادر اس لڑائی میں شہر پر قابض نہیں ہوئے ہیں، دلیرانہ تیغ زنی کرتے، دشمن پر دوڑتے اور (بہتوں کو) جان سے مارنے اور (بہتوں کو) زخمی کرنے کے بعد، پڑاؤ کی طرف لوٹ آئے۔ دنیا کو روشن کرنے والے بدھ کے دن، فروری کی چوبیسویں تاریخ کو ایک پہر دن چڑھے، مبارک ساعت میں باغ انصاف کے سرو سہی، آسمان جاہ کے ماہ درخشاں، فرخ شمائل، فرخندہ خو، ستارہ سپاہ چیف کمشنر بہادر نے اپنے مرکب کے سموں سے دہلی کی سرزمین کو، آسمان کے مانند ستارہ زار بنا دیا اور (سلامی کی) تیر و توپوں کی آواز نے خستہ دلوں کو مرہم لطف و مرحمت کی نوید بخشی۔

حاکم شہ و شاں کی آمد کے ساتھ شہر کے (مردہ) جسم میں روح دوبارہ لوٹ آئی۔

اس مسرت و شادمانی کو، دیکھ کر جو شہر میں نظر آرہی ہے، ایسا لگتا ہے کہ شاید شاہ جہاں لوٹ آیا ہے۔

جانیں۔ جب ہم نے جان لیا کہ تیغ و نگیں اور تاج و تخت کس کی ودیعت ہیں، یہ سرکشی اور بیزاری کس لیے؟ زمزمہ سنج شیراز کے قربان، کہ اس پردے میں کیسی فرد آموز نوا بلند کی ہے۔[1]

غلام کیا کرے اگر (آقا کے) حکم پر گردن نہ جھکائے۔ گیند کیا کرے

اگر خود کو بلے کے حوالے نہ کردے۔

22 رمارچ سے مجھ دیوانے کے دل میں یہ خلش ہے کہ دنیا فروردین کا مہینہ اور نوروز کا دن بھی رکھتی تھی اور وہ جہاں افروز دن انھیں دنوں کے امروز و فردا میں رونما ہوتا تھا۔ اس سال شاید یہ شہر، شہر خاموشاں ہے کہ بہار کی آمد آمد پر (کسی طرف سے) ہم کلبانگ مسرت نہیں سنتے۔ کوئی نہیں کہتا کہ یہ سال ترکوں کے "سالہائے دوازدہ گانہ" میں سے کون سا سال ہے اور اس سلسلۂ روز و شب میں، دن کے برابر ہونے کا وقت کیا ہے۔ اگر رصد گاہوں کے کوکب شناس مر گئے ہیں اور دن کے بادشاہ (سورج) کے سفر کا روزنامچہ اندراجات سے خالی رہ گیا ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ کچھ دروغ گو کم ہوئے اور کچھ جھوٹی باتیں سننے سے رہ گئیں۔ آفتاب برج حمل میں قیام کو بھولا نہیں ہے کہ سبزہ نہ اُگے اور پھول نہ کھلیں۔ ہاں نظام قدرت بھی نہیں بدلتا اور آسمان اس مقررہ گردش کے سوا، جو اس کے لیے مخصوص ہے، کوئی دوسری راہ اختیار نہیں کرتا۔ میں خود پر آنسو بہاتا ہوں باغ پر نہیں اور مجھے مقدر سے گلہ ہے، بہار سے نہیں ۔

دنیا لالہ و گل کے رنگ و نکہت سے معمور ہے اور میں ہوں، گوشۂ (تنہائی) ہے اور (مجبوری کے بھاری) پتھر کے نیچے دبا ہوا دامن۔

بہار کا موسم ہے اور میں بے نوائی کا مارا، بے برگ و باری کے عالم میں، گھر کا دروازہ بند کیے پڑا ہوں۔

میں روتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ زمانہ (کیسا) بے پروا ہے۔ اگر میں، کہ ایک گوشۂ اندوہ میں، دیوار کی جانب منہ کیے پڑا ہوں، سبزہ و گل نہ دیکھ سکوں اور مشام

---

[1] چہ کند بندہ کہ گردن نہ نہد فرماں را ۔ چہ کند گوی کہ تن در ندہد چوگاں را (سعدی)

ہوں۔ 22 جون کو منگل کے دن، جو مریخ کا دن ہے، ابھی اس تارے کے اثر و نفوذ کی گھڑیاں نہیں گزری تھیں اور دن کا بادشاہ (سورج) جس کا تاج ہر روز نیزے پر گھمایا جاتا ہے، مشرق سے بقدر یک نیزہ بلند نہیں ہوا تھا کہ آسمان غریو توپ کی، 21 جون کے گزرے ہوئے (اکیس) دنوں کی تعداد کے برابر، پرخروش آوازوں نے، دوستوں کے دل فرط انبساط و شادمانی سے سینوں میں اچھال دیے اور آگ سے زیادہ گرم، جلتی ہوئی راکھ دشمنوں کے سر اور منہ پر ڈال دی۔ شہر گوالیار کی فتح اور اس سنگین قلعے پر، جو زمین کا جگر گوشہ اور کوہسار کے دل کا ٹکڑا ہے، قبضے کی نوید، کیونکہ بارگاہ ایزدی سے سرکشوں کی موت کا پروانہ لے کر آئی، لہٰذا اس نے فرماں رواؤں اور فرماں برداروں کو بھی، آرزوؤں کے چراغ جل اٹھنے کی بشارت دی۔ یہ سرگزشت اس طرح ہے کہ۔ باغیوں نے گوالیار پر قبضہ کر لیا۔ شہر کے فرماں روا مہاراجہ جیا جی راؤ شہر اور حکومت چھوڑ کر آگرے چلے گئے، انگریز حاکموں سے کمک چاہی اور ایک بڑی امدادی فوج لے کر وطن کی طرف پیش قدمی کی، یہاں تک کہ ظفریابی نصیب ہوئی۔ گویا سارے آثار یہ بتاتے ہیں کہ اطراف و جوانب کے ان گمراہوں کا انبوہ، جو بھاگم بھاگ میں ہر طرف سے آ کر گوالیار میں جمع ہوئے اور یہاں ایک کھلی شکست کھائی، بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اب چند دن خستہ و خوار، رہزنی اور رہرو آزاری کرتے، ادھر ادھر زمین ناپتے پھریں اور آخر کار جابجا ذلت و خواری کے ساتھ ہلاک کر دیے جائیں۔ ان کے صحرا نورد گھوڑے، بے گیاہ بیابانوں میں زمین پر سینہ رگڑتے، دم توڑتے نظر آئیں گے اور ان کا ساز و سامان، پانی کے نالوں میں کیچڑ میں لتھڑا پڑا رہے گا۔ پھر ہندوستان خار و خس سے اس طرح پاک ہو جائے گا کہ جنگل کا کونہ کونہ سرسبزی و شادابی میں باغ کا خاکہ۔ اور ہر گلی کوچہ رونق و آبادی میں بازار کا نمونہ ہوگا۔ راقم الحروف کی زندگی کے تریسٹھ سال گزر چکے ہیں اور لاحقہ گوناگوں جانگدازیاں ظاہر کرتی ہیں کہ اب زمانے سے زیادہ فرصت (عمر) کی توقع بے جا ہوگی، ناچار جادو نوائے شیرازی کی آواز دلنواز، کہ میری طرف سے اس کی تابندہ روح پر درود ہو، یاد کرتا

خیر اندیش کی خیر خواہی اور کارسازی کا اس انتظام میں دخل رہا ہے۔ قصہ مختصر ایک نیک
بخت آدمی ہے، دوستوں کے ساتھ نیکی کرنے والا اور پاکی و خوشی کے ساتھ اچھی زندگی
گزارنے والا۔ اگرچہ میرے ساتھ پرانی شناسائی نہیں ہے، اتفاقاً کبھی ملاقات اور
بات چیت ہے، اور کبھی کبھی کوئی تحفہ بھیج کر مجھے احسان مند کرتا ہے اور داد مہربانی دیتا
ہے۔ میرے دوسرے دوستوں اور شاگردوں میں، ہیرا سنگھ جو ایک نیک نہاد اور نیک
نام نوجوان ہے، مجھ پر بہت مہربان ہے، آتا ہے اور میرا غم غلط کرتا ہے۔ اس غم
ویرانہ شہر آباد شہر کے دوسرے لوگوں میں عالی نسب شیو جی رام برہمن جو ایک جواں
دانشمند اور میرے بیٹے کی جگہ ہے، اس درویش دل ریش کو بہت کم تنہا چھوڑتا ہے اور
اپنی بساط کے بقدر میری فرماں برداری کرتا اور میرے کام بناتا ہے۔ اس کا بیٹا بال
مکند (بھی) جو ایک نیک طینت پرہیزگار نوجوان ہے، اپنے باپ کی طرح میری
فرماں برداری میں مستعد اور غمگساری میں یکتا ہے۔ دور دست دوستوں میں، آسمان مہر
و مروت کا ماہ دو ہفتہ شیوا زبان ہرگوپال تفتہ، جو میرا پرانا ہمدم و ہم آواز ہے اور چونکہ
شاعری میں مجھے اپنا استاد کہتا ہے، اس کا کلام حمد خدا اور اوصاف کے ساتھ میرے
لیے سرمایہ ناز ہے۔ قصہ کوتاہ، ایک مرد آزادہ رو ہے، مجسم محبت اور سراپا مہربانی۔
شاعری اس کے فروغ کا باعث اور اس سے شاعری کا ہنگامہ گرم۔ فرط محبت سے میں
نے اسے اپنے جان و دل میں جگہ دی ہے اور "مرزا تفتہ" خطاب دیا ہے۔ اس نے
میری خوشی کے لیے ایک مثنوی مجھے بھیجی ہے اور غزل اور خط ہمیشہ بھیجتا رہتا ہے۔ یہ باتیں،
جن کا بیان لازمی نہیں تھا میں نے خاص طور پر اس لیے بیان کیں کہ شکر محبت
و انسانیت ادا ہو جائے اور جب یہ داستان دوستوں کے ہاتھ میں پہنچے وہ جان لیں کہ
شہر دوستوں سے خالی ہے۔ باقی ماندہ لوگوں سے کہ چراغ سے محروم رہتے ہیں اور
ان میں سے ... غالب شہر آشنا، ہزار دوست، جو ہر گھر
میں دلی دوست اور ہر مکان میں دلی شناسا رکھتا تھا، اب اس تنہائی میں قلم کے سوا
کوئی ہمدم اور سائے کے سوا کوئی ساتھی نہیں۔

سے زیادہ ناگوار اپنی چانگڑا صدا سے تکلیف پہنچاتے ہیں۔ اب کہ جسمانی اور روحانی
عوارض و مصائب کے دباؤ اور شدت نے جسم و جاں کا پلیتھن نکال دیا ہے، اچانک
دل میں خیال آیا کہ اس کھلونے کے سنوارنے میں جس کا نام کتاب ہے کب تک
مشغول رہا جاسکتا ہے۔ یقیناً اس کشاکش کا انجام یا موت ہے یا دریوزہ گری۔ پہلی
صورت میں یہ ناگزیر ہے کہ یہ داستان ہمیشہ کے لیے تکمیل سے عاری اور انجام سے
محروم رہ جائے اور ناظرین کو افسردہ دل کرے۔ دوسری صورت میں، ظاہر ہے کہ
انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ فلاں گلی سے دھتکار کر، سرِ بازار ذلیل کیا گیا
اور فلاں در سے صدا لگانے پر رتی دو رتی کچھ مل گیا اور یہ سب کچھ کب تک بیان کیا
جاسکتا ہے اور آپ اپنی رسوائی کی جاسکتی ہے۔ پرانی پنشن اگر مل گئی، تب بھی (دل
کے) آئینے سے زنگ صاف نہیں کرسکے گی اور اگر نہ ملی تو آئینہ (مایوسی کے) چُور
سے چُور چُور ہوجائے گا۔ زیادہ بجوگی یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں، یہاں کی آب و ہوا
خستہ حالوں کے لیے سازگار نہ ہونے کے سبب، شہر سے بھاگنا پڑے گا اور کسی دوسری
جگہ سکونت اختیار کرنی پڑے گی۔ سالِ گزشتہ کے مئی کے مہینے سے جولائی 1858 تک
کی روداد میں نے لکھی ہے اور یکم اگست سے قلم ہاتھ سے رکھ دیا ہے۔ کاش ان تینوں
خواہشوں، خطاب، خلعت اور پنشن کے بارے میں، جن کی گزارش کا اس کتاب میں
بھی میں نے ذکر کیا ہے اور اب بدبینوں کی نظر بچا کر، بڑی امیدوں سے دل ان کی
طرف لگائے ہوئے ہوں؛ فیروز بخت، آفتاب افسر، آسماں تخت، جمشید حشم، فریدوں
فر، کاؤس کوس، سنجر نشاں، سکندر پایہ شہنشاہ کے حضور سے منظوری کا فرمان پہنچ جائے۔
وہ شہنشاہ کہ بادشاہِ روم اپنے تخت و تاج کی آبرو رہ جانے کے لیے اس کا منت گزار
ہے اور شہ آرائے روس کا دل اس کی شمشیر کشی کے خوف سے دونیم۔ اگر تقدیر یہ سوچ
رکھے۔ جہاں سوزی اس کی ناخوشنودی کا سبب ہے، ڈرتا نہیں تو کیوں تمام [illegible]
پہنچا رہا ہے اور اگر بدر روشن کی ندیشے سے زمین کو منور کرنے میں اس کی ہم چشمی
کا احتمال ہے، اس گستاخی کی معذرت نہیں چاہتا تو وہ رات خوف سے کیوں گھٹتا رہتا ہے۔

اپنی کوششوں سے دانشمندوں کو دور کرنے والی اور اپنی دانش آموزی سے لوگوں کو دانشمند بنانے والی۔

بہت کوشش کرنے والی اور عقل رسا رکھنے والی دانشمند فرماں روا دکھا رہے۔

پاک خدا اس کا مددگار ہے اور دہر کی محفل میں وہ تادیر سلامت رہیں۔

(کاش ایسا ہو کہ) میں بھی ملکہ عالم کی بخششوں سے بہرہ یاب ہو سکوں اور دنیا سے ناکام نہ اٹھوں۔

جب سلسلہ سخن یہاں تک پہنچا میں نے خاموشی اختیار کی۔ میں داستان سرائی نہیں چاہتا۔

تکمیل کے بعد اس کتاب کا نام دستنبو رکھا گیا اور اسے دست بدست ادھر ادھر بھیجا گیا کہ دانشوروں کی روح کو بالیدگی دے اور سخن گستروں کا دل ہاتھ سے چھین لے۔ امید ہے کہ یہ دستنبوئے دانش یزداں شناس لوگوں کے ہاتھ میں رنگ و بو کا گلدستہ ہوگا اور اہرمن منش لوگوں کی نگاہ میں آتشیں گیند۔ آمین۔

ہماری طبیعت ہر وقت رواں رہتی ہے۔ ہم آسمانی رازوں کا سرچشمہ ہیں۔

ہماری کاوش ہر تیر کا حصہ ہوتی ہے ہم کارزار میں (گویا) سامان خشم ہیں۔

ہے کہ "دستنبو" قلمبند کرتے ہوئے اس کی اشاعت کا خیال غالب کے ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھا اس لیے اس میں انھوں نے مصلحت اندیشی سے کام لیا ہے جب کہ خطوط نجی نوعیت کے تھے جن کے عام ہو جانے کا اس وقت تک کوئی امکان نہیں تھا۔

اردو میں 1857ء کے حوالے سے غالب کی پہلی تحریر اس خط کو سمجھا جاتا ہے جو انھوں نے حکیم غلام نجف خاں کو 21ر دسمبر 1857 کو لکھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

"میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا۔ نکالا نہیں گیا۔ لٹا نہیں۔ کسی محکمے میں بلایا نہیں گیا۔ معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔"

پھر 26ر دسمبر 1857ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"انصاف کرو، لکھوں تو کیا لکھوں؟ کچھ لکھ سکتا ہوں یا کچھ لکھنے کے قابل ہے؟ تم نے جو مجھ کو لکھا تو کیا لکھا اور اب میں جو لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں۔ بس اتنا ہی ہے کہ اب تک ہم تم جیتے ہیں۔ زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھوں گا۔"

انھی کے نام 9ر جنوری 1858 کے ایک مکتوب میں دلی کی حالت کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچتے ہیں:

"جو دم ہے، غنیمت ہے۔ اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں، بعد گھڑی بھر کے کیا ہو، کچھ معلوم نہیں۔ قلم ہاتھ میں لیے پر جی بہت کچھ لکھنے کو چاہتا ہے مگر کچھ نہیں لکھ سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیں گے ورنہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

مولانا مہر کے الفاظ میں غالب کے دل پر اس انقلاب کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ اس سے پہلے کے دور اور بعد کے دور کو وہ دو الگ عالم سمجھنے لگے۔ ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"صاحب تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا؟ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت میں

"میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قلزمِ خوں کا شناور رہا ہوں۔ دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا، نہ قید ہوا، نہ مارا گیا۔ کیا عرض کروں، میرے خدا نے مجھ پر کتنی عنایت کی اور کیا نفسِ مطمئنہ بخشا۔ مال و آبرو میں کوئی فرق نہیں آیا۔"

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں دہلی کی بربادی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

"قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنویں یک قلم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس طرف کوئی بانس نشیب تھا، اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں باقی سب اٹ گیا ہے۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی کٹرہ، رامجی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رامجی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ اور حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ قصہ مختصر شہر کا صحرا ہو گیا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحرا، صحرائے کربلا ہو جائے گا   اے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں، دلی کہاں؟ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے، چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر، نہ بازار، نہ نہر۔

صاحب! کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ دلی کو ویسی ہی آباد جانتے ہو جیسی تھی۔ قاسم جان کی گلی، خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ کے پھاٹک تک بے چراغ ہے۔ ہاں آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسن خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیاء الدین خاں کے کمرے میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکانوں میں ایک اور صاحب عالی شان انگلستان تشریف رکھتے ہیں   لال کنویں کے محلے میں خاک اڑتی ہے۔"

بے حواس ہو جاتے ہیں، حس جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متفکرہ میں فرق آگیا ہے تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ کیا غم ہے؟ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت۔ میں قلعۂ نامبارک سے قطع نظر کرکے اہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد مرزا، انیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اے لو بھول گیا۔ حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ ان کو کہاں سے لاؤں؟ غم فراق حسین مرزا، یوسف مرزا، میر مہدی، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے خوش ہوتے۔ گھر ان کے بے چراغ، وہ خود آوارہ، سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے، مگر میں علی کو گواہ کرکے کہتا ہوں کہ اب اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔ یہاں اغنیاء و امراء کے اولاد و ازواج بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔"

خط کی آخری تین سطروں میں امرائے دہلی کی بربادی اور بدحالی کا ذکر کتنے دردناک الفاظ میں کیا ہے۔ غالب کو اس کا بڑا رنج تھا کہ ان کے اکثر دوست اور ملنے والے مارے گئے یا تباہ ہوگئے۔ لکھتے ہیں:

"کوئی یہ نہ سمجھے کہ اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے، اس کا بیان تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھوں قتل ہوگئے ان میں سے کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے، جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کو زیست کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے

والا بھی نہیں ہوگا۔''

پھر لکھتے ہیں:

''بھائی وہ زمانہ آیا ہے کہ سینکڑوں عزیز راہی ملک عدم ہو گئے۔ سینکڑوں ایسے مفقود الخبر ہوئے کہ ان کی مرگ وزیست کی خبر نہیں۔ جو دو چار باقی رہے خدا جانے کہاں بستے ہیں کہ ہم ان کے دیکھنے کو ترستے ہیں۔''

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

''ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں اور مروں تو کوئی عزادار نہیں۔''

ایک جگہ لکھا ہے:

''سینکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس ساٹھ برس میں مر گئے خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو شاید میرا کوئی جاننے والا نہ بچا ہو۔''

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط کی چند سطریں:

''اس چرخ کج رفتار کا برا ہو، ہم نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک و مال جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے۔ ایک گوشہ و توشہ تھا، چند مفلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے:

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا، ایک مگر دیکھنا

کل سے میکش مجھ کو بہت یاد آتا ہے۔ سو صاحب اب تم ہی بتاؤ کہ میں تم کو کیا لکھوں۔ وہ صحبتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو اور تو کچھ بن نہیں آتی، مجھ سے خط پہ خط لکھواتے ہو۔ آنسوؤں سے پیاس نہیں بجھتی۔ یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔''

غالب کے ایک نہایت عزیز دوست اور مخلص قدرداں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تھے۔ نواب صاحب پر باغیوں کی اعانت کا الزام لگا، وہ گرفتار ہو گئے اور محض ان کی جائداد ہی ضبط نہیں ہوئی بلکہ سات سال کی قید کا حکم بھی ہو گیا۔ غالب تمنا کرتے ہیں:

سے ان کی بدگمانی کو ظاہر کرتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کا ذکر غالب کے اردو مکاتیب میں صرف دو جگہ آیا ہے۔ میر مہدی مجروح نے پوچھا تھا کہ "دستنبو" میں بادشاہ کے دہلی سے رخصت ہونے کے حالات کیوں نہیں لکھے؟ جواب میں لکھتے ہیں:

"بھائی میں نے 11 رمئی 1857 سے 21 جولائی 1858 تک کا حال لکھا ہے اور خاتمے میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ امین الدین خاں کی جاگیر کے ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیونکر لکھتا؟ ان کو جاگیر اگست میں ملی، بادشاہ اکتوبر (1858) میں گئے۔ کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا۔"

دوسری جگہ بہادر شاہ کی وفات کا ذکر ہے:

"7 رنومبر (1862) مطابق 14 رجمادی الاول، سال حال جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے آزاد ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

○

ابتدا میں غالب کا انگریز حکام سے رابطہ پیدا کرنے کا خیال نہ تھا۔ ہرگوپال تفتہ کو 30 رجنوری 1858 کے خط میں لکھا ہے:

"مجھ کو دیکھو نہ آزاد ہوں نہ قید۔ نہ رنجور ہوں نہ تندرست۔ نہ خوش ہوں نہ ناخوش۔ نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جیے جاتا ہوں، باتیں کیے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ہے، جو تقریر ہے بر سبیل حکایت ہے۔"

انھوں نے غدر کے فوراً بعد کسی انگریز سے ملنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ دار و گیر کے زمانے میں اکثر لوگ اپنے بچاؤ کے لیے جھوٹے افسانے بنا بنا کر حکام کی نظروں میں اعتبار حاصل کر رہے تھے۔ جعل ساز مخبروں کا بہت زور ہو گیا تھا۔ بہتیرے ان مخبروں کی بد نیتیوں کے باعث پھانسی پا گئے۔ غالب لکھتے ہیں:

"مفرور نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا، دارو گیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی باز پرس ہو تو بلایا جاؤں گا۔ مگر ہاں جب بلایا نہیں گیا خود بھی بروئے کار نہیں آیا۔ کسی حکام سے نہیں ملا، خط کسی کو نہیں لکھا، کسی سے درخواستِ ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنشن بند ہے، کہو یہ دس مہینے کیونکر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔"

○

دلی میں بغاوت کا آغاز 11 مئی 1857ء کو ہوا تھا۔ غالب اسی دن خانہ نشیں ہو گئے تھے لیکن شہر کے حالات سے انھوں نے باخبر رہنے کی کوشش کی۔ جو خبریں انھیں ملتی گئیں وہ انھیں قلمبند کرتے گئے اور اس طرح "دستنبو" معرضِ وجود میں آئی۔ "دستنبو" بھی 1857ء کے واقعات کی روداد سناتی ہے مگر احتیاط پسندی کے ساتھ۔ یہی واقعات جب غالب کے خطوط میں بیان ہوئے ہیں تو بیان نسبتاً زیادہ واضح اور صاف ہے اور ان واقعات کے ردِ عمل کے طور پر غالب جس ناقابلِ تلافی غم سے دوچار ہوئے تھے، اس کو زیادہ صراحت کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔ ان کے خطوں سے جو داستان ابھرتی ہے اس کی کڑیاں انھی کے لفظوں میں اس طرح جڑتی ہیں:

11 مئی 1857 کو یہاں فساد شروع ہوا، میں نے اسی دن گھر کا دروازہ بند اور آنا جانا موقوف کر دیا۔ بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنا شروع کی۔

اب پوچھو تو کیوں کر مسکنِ قدیم میں بیٹھا رہا؟ میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرائے کو رہتا ہوں۔ اور یہاں قریب کیا، دیوار بدیوار ہیں گھر حکیموں کے۔ اور وہ نوکر ہیں راجہ نریندر سنگھ بہادر والیِ پٹیالہ کے۔ راجہ صاحب نے صاحبانِ عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بروقتِ غارتِ دہلی یہ لوگ بچے رہیں۔ چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر

[illegible] امیر غریب سب نکل گئے، جو رہ گئے نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حالات لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے، اور باز پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگامے میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعین ہوا ہوں۔ خواہ اس کو نوکری سمجھو، خواہ مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا، صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے مگر چونکہ میری طرف سے بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں پائی گئی لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں، مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی شنبہ پنجم دسمبر 1857 تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال معلوم نہیں۔

بسکہ فعال ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا؟ — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے غالب — کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی۔ قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع جامع مسجد کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھول والوں کا۔ یہ پانچوں باتیں اب نہیں، پھر کہو دلی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔ نواب گورنر جنرل بہادر 15/دسمبر 1859 کو یہاں داخل ہوں گے۔ دیکھیے کہاں اترتے ہیں اور کیونکر دربار کرتے ہیں۔ آگے کے درباروں میں سات جاگیردار تھے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ جھجھر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، فرخ نگر، دوجانہ، پاٹودی، لوہارو۔ چار معدوم محض ہیں، جو باقی رہے، ان میں سے دوجانہ ولوہارو تحت حکومت ہانسی وحصار۔ پاٹودی حاضر۔ اگر حصار کے صاحب کمشنر بہادر ان دونوں کو یہاں لے آئے تو تین، ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے مہاجن لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں، بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم بہ اسد۔ تینوں مردود ومطرود، محروم ومغموم۔

تو ز کر بیٹھے ہیں ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں، ایک آزردہ سو خموش، دوسرا غالب وہ بے خود ومدہوش، نہ سخنوری رہی نہ سخن دانی۔ کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلی وائے دلی، بھاڑ میں جائے دلی۔

چوک میں بیگم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض کے پاس جو کنواں تھا، اس میں سنگ وخشت وخاشاک ڈال کر بند کر دیا۔ بلی ماروں کے دروازے کے پاس کئی دکانیں ڈھا کر راستہ چوڑا کر لیا۔ شہر کی آبادی کا حکم، خاص وعام کچھ نہیں، پنشن داروں سے حاکم کا کام کچھ نہیں۔ تاج محل، مرزا قیصر، مرزا جواں بخت کے سالے مرزا ولایت علی بیگ عرف بجے پوری کی بیوی، ان سب کی الہ آباد سے رہائی ہوگئی۔ بادشاہ، مرزا جواں بخت، مرزا عباس شاہ، زینت محل کلکتے پہنچے اور وہاں سے جہاز پر چڑھائی

ہے، جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دو روپیہ جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس کے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدار میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا، بھائی تو مجھے نقشے میں نہ رکھ۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار 1850 سے حکیم پٹیالے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نکالا گیا۔ کرنل براؤن صاحب کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ یہ عبارت جمعدار نے میرے نقشے کے ساتھ کوتوالی میں بھیج دی۔ یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان دکان کیوں بناتے ہیں۔ جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھا دو اور آئندہ کی ممانعت کا حکم سنا دو۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے، بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے۔ دیکھیے شہر بسنے کی کون سی صورت ہے۔ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں وہ شہر میں آتے ہیں۔ الحکم للہ والملک للہ۔

مرزا غالب نے بعض خطوں میں بھی اور اس قطعے میں بھی جو اوپر درج ہوا، یہ کہا ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے انگریز زیادہ بدگمان ہیں اسی لیے ان پر زیادہ سختی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی ہوگی کہ دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ باغیوں کی سربراہی کی ذمہ داری بہادر شاہ ظفر اور بیگم حضرت محل کو سونپی گئی تھی۔ مرزا غالب کے بیانات محض اظہار

واقعہ کے لیے ہیں، کسی طرح کی تفریق پسندی کا نتیجہ نہیں۔ اپنا مسلک و مشرب انھوں نے ان لفظوں میں واضح کر دیا ہے:

''میں بنی آدم کو، مسلمان یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ رہی وہ عزیزداری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں، اس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مدارج و مراتب ہیں۔ میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں، کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔''

یہ تمام خطوط جن میں یہ روداد بیان ہوئی ہے، خلیق انجم نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''غالب کے خطوط'' میں تاریخی ترتیب سے جمع کر دیے ہیں۔ میں نے خطوط کے متعلقہ حصے نقل کیے ہیں، مکمل خطوط کتاب کی جلد دوم میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ میں اوپر بھی کہہ چکا ہوں غالب کو ابتدا میں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی ان کے اردو خطوط کی اشاعت عمل میں آئے گی اسی لیے 1857 کے حالات بیان کرتے ہوئے ''دستنبو'' میں جہاں انھوں نے شعوری طور پر احتیاط برتی ہے وہاں خطوط میں غیر شعوری طور پر بہت سی ایسی سچائیاں بیان کر دی ہیں جو انھوں نے دیکھیں یا سنیں اور جن سے انگریز حکام کے سفاکانہ طور طریقوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کے اردو خطوط کو یکجا کر کے شائع کرنے کا خیال اولاً ان کے دو شاگردوں منشی ہرگوپال تفتہ اور منشی شیو نرائن آرام کو آیا تھا۔ غالب کو ان کے اس ارادے کا علم ہوا تو انھوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ بعد میں چودھری عبدالغفور نے ان خطوط کو شائع کرنا چاہا جو انھیں لکھے گئے تھے لیکن بہ وجوہ وہ بھی اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ تفتہ اور آرام کو خطوط کی اشاعت سے باز رکھنے کی تاویل غالب نے اپنے ایک خط میں جو آرام کے نام ہے، اس طرح کی ہے:

''کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی تشہیر میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر

کیا ضروری ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔" (خط بہ نام آرام، 18 نومبر 1858)

اردو خطوط کی اشاعت کو اپنے شکوہ سخنوری کے منافی سمجھنے کے علاوہ انھیں عام نہ کرنے کی ایک وجہ غالب کے ذہن میں یہ بھی رہی ہوگی کہ ابھی 1857ء کے ہنگامۂ دارو گیر کو فرو ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے، مبادا ان خطوط کی اشاعت حاکمان وقت کو ان کی طرف سے بدگمان کردے جن میں اس ہنگامۂ دارو گیر کا ذکر آیا ہے۔ اس خیال کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ تین سال بعد جب غلام غوث بے خبر نے یہی خواہش کی تو غالب نے اسے منظور کرلیا اور انھیں کئی خطوط کی نقلیں خود فراہم کیں اگر چہ اس کا دیباچہ لکھنے پر وہ اب بھی تیار نہ تھے۔ بے خبر کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اگر ایک بندۂ قدیم کہ عمر بھر فرماں پذیر رہا ہو، بڑھاپے میں ایک حکم بجا نہ لاوے تو جرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعۂ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچے پر موقوف ہے تو اس مجموعے کا چھپ جانا بالقطع نہیں چاہتا بلکہ چھپ جانا بالقسم چاہتا ہوں۔"

غلام غوث بے خبر 1961 سے غالب کے خطوط جمع کر رہے تھے، غالب چار سال تک دیباچہ لکھنے سے گریز کرتے رہے لیکن خطوط کی اشاعت کے متمنی بھی رہے۔ بالآخر اکتوبر 1968 میں غالب کے خطوط کا پہلا مجموعہ "عود ہندی" کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں بے خبر کے جمع کیے ہوئے خطوں کے علاوہ وہ خط بھی شامل تھے جو چودھری عبدالغفور سرور اور ممتاز علی خاں نے جمع کیے تھے۔ اس میں دو دیباچے ہیں، ایک سرور کا لکھا ہوا اور دوسرا ممتاز علی خاں کا۔

غالب کے خطوط کا دوسرا مجموعہ "اردوئے معلیٰ" کے نام سے مارچ 1969 میں غالب کے انتقال کے دوڈھائی ہفتے بعد شائع ہوا۔ اس کا دیباچہ میر مہدی مجروح نے اور خاتمہ قربان علی بیگ نے لکھا ہے۔ یہ مجموعہ بھی غالب کی زندگی میں مرتب ہو گیا تھا اور انھوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔

ان مشہور مجموعوں کے علاوہ اب تک غالب کے خطوط کے اور بھی کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ادبی خطوط (مرزا محمد عسکری) مکاتیب غالب (امتیاز علی خاں عرشی) خطوط غالب (مولوی مہیش پرشاد) خطوط غالب (غلام رسول مہر) نادرات غالب (آفاق حسین آفاق) غالب کے خطوط[1] (تنویر احمد علوی) اور غالب کے خطوط (خلیق انجم)۔ آخرالذکر میں غالب کے تمام دستیاب خطوط یکجا کر دیے گئے ہیں جن کی تعداد 886 ہے۔

---

[1] یہ کتاب [illegible] ٹرسٹ نے شائع کی ہے۔

انگریزی سامراج کے خلاف مئی 1857 میں جب میرٹھ سے قومی بغاوت کا آغاز ہوا اور یہ بغاوت تیزی سے پورے ملک میں پھیل گئی، اس وقت مرزا غالب بڑھاپے کی سرحدوں میں داخل ہو چکے تھے۔ سن رسیدگی کے پیدا کردہ جسمانی اضمحلال کی وجہ سے بھی اور ان کی ان مزاجی کیفیات کی وجہ سے بھی جو امن واماں کے ماحول کی متقاضی رہتی تھیں، ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس بغاوت میں عملی طور پر شریک ہو سکیں، لیکن جو واقعات ان کے گرد و پیش رونما ہو رہے تھے، ان سے چشم پوشی انھوں نے نہیں کی۔ وہ دہلی میں باغیوں کی آمد اور دہلی پر ان کے قبضے کے بعد سے، باغیوں کی پسپائی اور دہلی پر انگریزوں کے اقتدار کی بحالی تک، گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلے لیکن شہر کے حالات سے انھوں نے خود کو بے خبر نہیں رکھا اور کسی نہ کسی طرح تمام اہم اطلاعات حاصل کرتے رہے۔ انھوں نے صرف اطلاعات کے حصول پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ انھیں تاریخ وار قلم بند بھی کرتے رہے۔ یہ پیشکش 1857 کے حالات کو سمجھنے میں ہماری راہنمائی کرے گی جسے اردو کے ممتاز شاعر مخمور سعیدی نے 1857 کی 150 ویں سالگرہ کے موقع پر مرتب کیا ہے۔

مخمور سعیدی موجودہ دور کے ممتاز شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کے دس مجموعے شائع ہو کر قبول عام کی سند پا چکے ہیں۔ اردو کے کلاسیکی سرمایہ پر ان کی گہری نظر ہے اور فارسی زبان و ادب سے بھی ان کی قریبی شناسائی ہے۔ بہ حیثیت شاعر انھوں نے کئی بیرونی ملکوں میں ہندوستان کی نمائندگی کی ہے۔ انھیں ان کے شعری مجموعے 'راستہ اور میں' کے لیے ساہتیہ اکادمی انعام 2006 سے نوازا گیا ہے۔

مخمور سعیدی نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی نثری کتابوں کی تعداد ڈیڑھ درجن ہے۔ وہ اردو کے کئی اہم رسالوں کے مدیر اور دلی اردو اکادمی کے سکریٹری رہے ہیں۔ آج کل قومی اردو کونسل میں ادبی مشیر ہیں۔

ISBN 978-81-237-5004-0

قیمت: 35.00

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

Cover Visual Courtesy: Cover Lithograph shows the pitched battle during the first war of independence - 1857.
In 1877 Queen Victoria took the title of Empress of India on the advice of her Prime Minister, Benjamin Disraeli.